ماہنامہ

گوجرانوالہ

فلاحِ آدمیّت

MARCH 2007

Reg: CPL No. 80

مارچ 2007

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْهِ تَبْتِیْلًا

صداقت — اللہ — محبت

سِلسلہ عالیہ توحیدیہ

ہے عرش بھی نیچا جو ہو پروازِ مسلسل

☆ موجودہ دور کے عظیم صوفی اور بانی سلسلہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی تعلیم کا علمبردار۔

☆ رُہبانیت اور شرک سے پاک اور قرآن وسنت کے عین مطابق راہ فقر کی تعلیم کا داعی۔

☆ وحدتِ اُمت، اکرام انسانیت اور فلاح آدمیت کا ترجمان۔

☆ فرقہ واریت، غصہ اور نفرت ختم کر کے عالمگیر محبت اپنانے کا نقیب۔

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ

منشور دعوت

وَاذْكُرْ رَبَّكَ فِیْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّ خِیْفَةً

وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ

وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِیْنَ ؕ

الاعراف۔205

ترجمہ

اپنے رب کو اپنے دِل میں عاجزی اور ڈر کے

ساتھ، اُونچی آواز نکالے بغیر، صبح وشام

یاد کرو۔ اور غافلوں میں سے نہ ہونا۔

بیادگار **خواجہ عبدالحکیم انصاری** رح

بانی سلسلہ

نگران وسرپرست

محمد صدیق ڈار صاحب توحیدی

شیخ سلسلہ عالیہ توحیدیہ
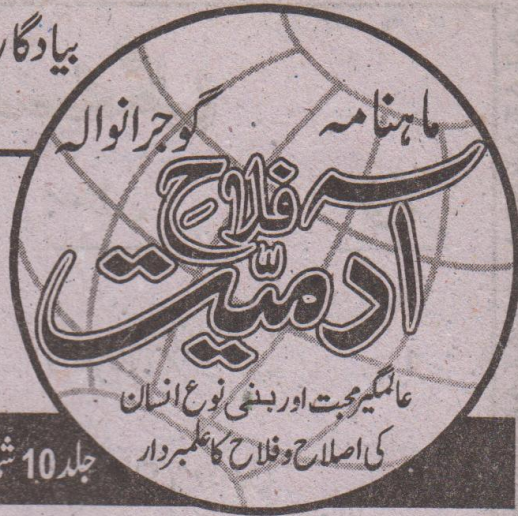
جلد 10 شمارہ 6 مارچ 2007ء صفر 1428ھ

قیمت ——— 20/- روپے

سالانہ فنڈ ——— 200/- روپے

شیخ سلسلہ سے رابطہ کیلئے:

محمد صدیق ڈار توحیدی

مرکز تعمیر ملت نزد توحید کالونی کوٹ شاہاں گوجرانوالہ

Ph:055-3862835
Mob: 0300-6493335

ایڈیٹر سے رابطہ کے لئے:

وحید احمد

تھانہ روڈ بلدیہ مارکیٹ گکھڑ ضلع گوجرانوالہ

Ph:055-3881379
Mob:0300-7409533

پبلشر عامر رشید انصاری نے معراجدین پرنٹرز مچھلی منڈی لاہور سے چھپوا کر مرکز تعمیر ملت جی ٹی روڈ گوجرانوالہ سے شائع کیا

Fax: No. +92-55-4222020
E-mail: tohidia@hotmail.com

سلسلہ عالیہ توحیدیہ

اس شمارے میں

(درس قرآن)

نبوت بشریت کا خاصہ

(ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک)

ایک نظریہ جسے قرآن مجید فرقان حمید نے بار بار غلط کہا ہے، وہ ہے کفار کا یہ کہنا کہ کسی بشر پہ کبھی اللہ کا کلام نازل نہیں ہوا۔ کوئی پوچھے کہ موسیٰ علیہ السلام کون تھے؟ ابراہیم علیہ السلام کون تھے؟ یہ سارے انبیاء کون تھے؟ اور رب العزت فرماتے ہیں کہ وہ سب انسان تھے، نوعِ بشر میں سے تھے۔ ہاں اللہ کے قرب اور اس کی وحی کی وجہ سے ان کا مقام و مرتبہ عام انسانوں سے بہت بلند تھا۔ اِسی سورہ انعام کی آیت نمبر 130 میں مزید یہ بات آ رہی ہے۔ اِس سے پتا چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جہاں انسانوں میں رسول بھیجے ہیں، وہاں جنات میں بھی رسول بھیجے اور اللہ کا یہ قاعدہ ہے کہ جس قوم کو ہدایت دینا مقصود ہوتا ہے اسی قوم، اسی نوع، اسی جنس کا ایک فرد اس قوم کے اندر بھیجا جاتا ہے اور قیامت کے دن ان قوموں سے یہ سوال بھی کیا جائے گا کہ اے گروہ جن وانس! کیا تمہارے پاس خود تم ہی میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے تھے؟

دعوتِ توحید کا نرالا انداز

اس ذکر کے بعد تفصیل کے ساتھ توحید پر دلائل بیان کئے گئے ہیں اور مشرکین کو دعوت فکر دی گئی ہے۔ اس سلسے میں حشر کا ایک منظر بیان کیا گیا ہے کہ قیامت کے روز کس طرح ہر انسان خود اپنی زندگی کے سارے اعمال کا جوابدہ ہوگا۔ کوئی سفارش کسی کے کام نہیں آئے گی جب کہ اذن خداوندی نہ ہوگا اور اس روز خود ہر شخص یہ محسوس کرلے گا کہ دنیا میں میری زندگی، میرے دین اور ایمان کے ساتھ کھیلنے والے آج کل نظروں سے غائب ہو چکے ہیں۔ ملاحظہ فرمائیں کہ اس بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ کس قدر واضح اور غیر مبہم ہے اور اس حقیقت کے اس طرح آشکار ہونے کے باوجود اگر ہم غفلت کا شکار رہیں تو ہم سے زیادہ خود فریبی میں کون مبتلا ہوگا؟

فرمان الٰہی ہے:

ولقد جئتمونا فرادی کما خلقنکم اول مرة وترکتم ما خولنکم وراء ظھورکم وما نری معکم شفعاء کم الذین زعمتم

انهم فیکم شرکوء القد تقطع بینکم وضل عنکم ما کنتم تزعمون٥

''اور جیسا ہم نے تم کو پہلی دفعہ پیدا کیا تھا، ایسا ہی آج اکیلے اکیلے ہمارے پاس آئے ہو اور جو (مال و متاع) ہم نے تمہیں عطا کیا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو اور ہم تمہارے ساتھ سفارشیوں کو بھی نہیں دیکھتے (کیونکہ وہ ساتھ موجود نہیں) جن کی بابت تم خیال کرتے تھے کہ وہ تمہارے (شفیع اور ہمارے) شریک ہیں۔ آج تمہارے آپس کے سب تعلقات منقطع ہو گئے اور جو وعدے تم کیا کرتے تھے، سب جاتے رہے''۔٥ (الانعام:94)

آخرت کی تصویر کشی کے بعد وحدانیت پر دلائل کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو گٹھلی سے درخت نکالنے، مردے سے زندہ، رات کو دن سے نکالنے کا ذکر ہے۔ سورج اور چاند کی تقدیر، ستاروں سے راہنمائی کا سامان اور خشکی و تری کے فائدے، ساری انسانیت کو ایک فرد (آدم علیہ السلام) کے ذریعے سے پیدا کرنے کا ذکر، انفس و آفاق کے ان دلائل کے ساتھ ساتھ زمین سے اُگنے والی اجناس، اور پھلوں کی مختلف انواع و اقسام کو بھی مشاہداتی دلیل کے طور پر بیان فرمایا گیا۔ ان سب واضح اور بدیہی دلائل کی موجودگی میں بھی حضرت انسان کی کم عقلی کا رونا ہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

وجعلوالله شرکاء الجن وخلقهم وخرقواله بنین وبنت بغیر علم سبحنه و تعلی عما یصفون٥

''اور ان لوگوں نے جنوں کو اللہ کا شریک ٹھہرایا حالانکہ ان کو اسی (اللہ) نے پیدا کیا اور بے سمجھے لوگوں نے اس کے لئے بیٹے اور بیٹیاں بنا کھڑی کیں (حالانکہ) وہ ان باتوں سے پاک ہے جو اس کی بابت وہ بیان کرتے ہیں اور (اس کی شان اس سے) بلند ہے۔''

(الانعام:100)

بصائر قرآنی کا ذکر

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لئے بے حد و حساب رحیم و کریم ہے، اُس کی شانِ کریمی ہے کہ اس کے بعد بھی مزید دلائل اپنی وحدانیت پر قائم کئے۔ ان میں انسانوں کو آفاقی دلائل میں غور و تدبر کی دعوت دے کر وحدانیت کو واضح فرمایا۔

1۔زمین وآسمان کی تخلیق کے ذکر کے بعد فرمایا کہ اس کی بیوی اور اولا دکوئی نہیں۔
2۔وہ ہر چیز کا خالق ہے۔اس کی مثال تو کُجا اس کو انسان کی یہ آنکھیں دیکھ بھی نہیں سکتیں۔
اس کے بعد دعوت تدبر کا ایک نیا اور اچھوتا انداز اختیار فرمایا:

قد جاء کم بصائِر من ربکم فمن ابصر فلنفسه ومن عمی فعلیها ط

''(اے محمد ﷺ اُن سے کہ دیجیے) تمہارے (پاس) رب کی طرف سے (روشن) دلیلیں پہنچ چکی ہیں۔تو جس نے (ان کو آنکھ کھول کر) دیکھا اس نے اپنا بھلا کیا اور جو اندھا بنا رہا، اس نے اپنے حق میں برا کیا۔'' (الانعام:104)

معلوم ہوا کہ قرآن مجید کو آنکھیں کھول کر اچھی طرح سمجھ کر فہم وتدبر سے پڑھنا چاہئے، بے فہم اندھوں کی طرح نہیں، ورنہ، بصائر (بصیرت افروز حقائق) جو قرآن کا اصل خاصہ ہیں، آنکھوں سے اوجھل رہیں گے بلکہ بے فہم اور بے بصیرت اندھوں کی طرح فر فر پڑھتے جانا باعث وبال بن سکتا ہے۔

مدارِ نجات

اور جب یہ روشن دلیلیں آچکی ہیں تو ایک سلیم الفطرت انسان کا کردار کیا ہوگا، اس کے لئے ارشاد ہوا:

اتبع مااوحی الیك من ربك لا اله الاهو

''اور جو حکم تمہارے رب کی طرف سے تمہارے پاس آیا ہے، اس کی پیروی کرو۔اس (اللہ) کے سوا کوئی معبود نہیں ہے،، (الانعام:106)

اس آیتِ کریمہ میں مدار نجات یعنی اتباع کی اہمیت کو اُجاگر کر دیا گیا اور پھر واضح اور دوٹوک انداز میں اعلان کر دیا کہ ہم نے اپنے رسول کو تم پر نگران بنا کر نہیں بھیجا اور نہ ہی وہ لوگوں کے اعمال کے جوابدہ ہیں۔

اوصافِ مبلغ

اس کے بعد مبلغ کے لئے ایک اہم ترین ہدایت مذکور ہے:

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللـه فیسبوا الله عدوا

بغیر علم کذلک زینا لکل امۃ عملھم ○

''اور جن لوگوں کو یہ مشرک اللہ کے سوا پکارتے ہیں، ان کو برا نہ کہنا کہ یہ بھی کہیں اللہ کو بے ادبی سے بے سمجھے برا (نہ) کہ بیٹھیں۔ اس طرح ہم نے ہر ایک فرقے کے اعمال (ان کی نظروں میں) اچھے کر دکھائے ہیں۔،، (الانعام:108)

اس آیت میں داعی اور مبلغ کو ہدایت فرمائی گئی کہ جوش خطابت میں کہیں ایسا نہ ہو کہ تم دشمن کے معبودوں اور ان کے راہنماؤں کو برا بھلا کہہ بیٹھو کیونکہ اس کے لازم نتیجے کے طور پر وہ تمہارے حقیقی معبود کی شان میں گستاخی کریں گے۔

بدترین شخص کون؟

اس سلسلے میں ایک حدیث کا مضمون ملاحظہ فرمائیں:

ارشادِ رسول اکرم ﷺ:

بدترین شخص وہ ہے جس نے اپنے ماں باپ کو گالی دی۔ صحابہ ؓ نے حیرانی سے دریافت کیا کہ اے اللہ کے رسول ﷺ ایسا بدبخت کون ہوگا جو اپنے ماں باپ کو گالی دے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ایک شخص کسی کے ماں باپ کو گالی دیتا ہے اور وہ جواب میں پہلے شخص کے ماں باپ کو گالی دے گا۔ ظاہر ہے یہ پہلا شخص اپنے ماں باپ کو گالی دلوانے کا خود باعث بنا۔ (ترمذی)

اس آیت کریمہ ہی میں یہ ارشاد ہے کہ تمہارا دشمن لاعلمی و جہالت کے باعث اللہ تعالیٰ کو گالی دے گا کیونکہ وہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی جلالتِ شان سے کما حقہ آگاہ نہیں اگر وہ آگاہ ہوتا تو شرک کا ارتکاب نہ کرتا۔

مناظرہ بازی

اس آیت میں مناظرہ و مجادلہ سے بھی ایک گونہ اجتناب کا حکم دیا گیا ہے کیونکہ مناظرے کے انجام میں ہدایت ملنا بہت ہی نادر ہے۔

اعمال قبیحہ کو شیطان خوبصورت بنا کر کے پیش کرتا ہے اور ہر شخص جب بھی کسی برائی کی راہ پر چلتا ہے تو اس برائی کے جواز کے لئے کوئی نہ کوئی راہ ضرور گھڑ لیتا ہے اور یہ شیطان صفت انسان اس طرح خود فریبی کا شکار ہو کر برائی میں غرق ہوتا رہتا ہے۔ اس میں ایک مزید خرابی یہ پیدا ہو جاتی کہ جب کوئی اللہ کا نیک بندہ ایسے لوگوں کو راہ ہدایت کی جانب بلائے تو ایسے لوگ عذر

لنگ کے طور پر معجزات طلب کرتے ہیں حالانکہ تاریخ انسانیت اس بات کی شاہد ہے کہ بے شمار اقوام ایسی گزری ہیں کہ معجزات دیکھ کر بھی راہ ہدایت ان کے حصے میں نہ آ سکی۔

کوئی مبلغ جب کسی قوم کو راہ ہدایت کی دعوت دیتا ہے تو قوم کی جانب سے دشمنی ضرور ہوتی ہے نبی اکرم ﷺ کو یہ حقیقت ان الفاظ میں سنائی گئی:

وکذلک جعلنا لکل نبی عدوا شیطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورا o (الانعام 112)

''اور اسی طرح ہم نے شیطان (صفت) انسانوں اور جنوں کو ہر پیغمبر کا دشمن بنا دیا تھا۔ وہ دھوکا دینے کے لیے ایک دوسرے کے دل میں ملمع کی باتیں ڈالتے رہتے تھے''۔

تکمیل شریعت

لیکن ان تمام مخالفتوں اور دشمنیوں کے باوجود وہ قدسی نفس لوگ راہ حق پر گامزن رہے اور پیغام ربانی کو اس مقام پر پہنچا دیا کہ آپ کے دور میں یہ نوید اور خوشخبری اتار دی گئی:

وتمت کلمت ربک صدقا وعدلا لامبدل لکلمتہ o

''اور تمہارے رب کی باتیں سچائی اور انصاف میں پوری ہیں اور ان باتوں کو بدلنے والا کوئی نہیں'' (الانعام 115)

اس آیت کے نزول نے گویا ختم وحی وعصمت پر مہر ثبت کر دی کہ جب رب کی باتیں اپنی سچائی اور انصاف میں کامل ہو چکی ہیں تو مزید کسی نبی کی ضرورت وحاجت نہ رہی البتہ یہ فریضہ رسالت اور پیغام ربانی آئندہ نسلوں تک پہنچانے کی ذمہ داری امت مسلمہ کے سبھی افراد پر ڈال دی گئی جس کی تفصیلات ہم سورۃ آل عمران کے سلسلے میں بیان کر چکے ہیں۔

صدق، امانت اور عدل

یہ بات تاریخ کے مطالعے سے واضح ہو جاتی ہے کہ حضور اکرم ﷺ کی بعثت تک جتنی بھی شریعتیں آئیں، سب میں صدق اور عدل ساتھ ساتھ تھے لیکن یہ علاقائی، وقتی اور قومی مصلحتوں کی رعایت رکھتے ہوئے تھا۔ اب صدق، اپنے کمال کو پہنچ گیا۔ ذرا غور فرمائیے! کمال علم صدق ہوتا ہے اگر اسی صدق پہ مکمل طور پر عمل کیا جائے تو اس کو امانت کہتے ہیں لیکن اگر خود اپنے شوق سے عمل نہ کرے بلکہ اس کو کوئی عدالتی یا معاشرتی نظام ایسا کرنے پر مجبور کر دے تو اُسے عدل کہا جاتا

ہے۔یوں عدل اجتماعی طور پر صدق پر عمل کا نام ہے۔حضور اکرم ﷺ کی بعثت سے ہم پر جو شریعت نافذ ہے، وہ صدق اور عدل کی معراج ہے۔اب اس کو کوئی بدل نہیں سکے گا اور نہ کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کر سکے گا جیسا کہ پہلی اُمتوں نے صحف ابراہیم، صحف تورات یا پھر صحف زبور کو اپنی مرضی سے بدل ڈالا۔تاریخ نے ثابت کر دکھایا ہے کہ اللہ کے کلام میں اب تک کوئی تبدیلی نہیں آ سکی ہے بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ اللہ کے کلام سے جو چیز بھی متعلق ہو جاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی بھی حفاظت فرماتے ہیں۔

ان ولی اللہ الذی نزل الکتب وھو یتولی الصحین

،،میرا آقا اور مددگار تو وہ ہے جس نے اس کتاب کو نازل کیا اور وہ صالحین کی حفاظت کرتا ہے۔(الانعام:196)

زبان ایک مسلسل تغیر پزیر چیز ہے لیکن عربی زبان محفوظ ہوگئی ہے۔قرآن مجید کی وجہ سے حضور ﷺ کی سیرت طیبہ محفوظ ہوگئی اور حد یہ کہ جاہلیت کا عربی ادب بھی محفوظ ہو گیا اور اس سے بھی حد یہ کہ امرؤُ القیس جیسے رومانوی شاعر کا کلام بھی محفوظ ہو گیا کیونکہ عربی زبان سمجھنے میں اس کی بھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔

جمہوریت کے بارے میں قرآن فیصلہ

جب ابلیس اس اعتبار سے لوگوں کو بہکانے کے قابل نہ رہا کیونکہ اللہ کا کلام مکمل ہو گیا اور اس کی حفاظت کا ذمہ بھی اللہ تعالیٰ نے خود لے لیا تو اس نے گمراہی وضلالت کا ایک نیا باب اس عنوان سے کھول دیا کہ زمین میں بسنے والے لوگوں کی اکثریت کی رائے کیا ہے؟ اس کا احترام ہونا چاہئے اکثریت کی اس رائے کے بارے میں حقیقت حال کو واضح فرماتے ہوئے اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا:

وان تطع اکثر من فی الارض یضلوک عن سبیل اللہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون٥

”اے محمد ﷺ! اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں اللہ کے راستے سے بھٹکا دیں گے۔وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ درحقیقت تمہارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور کون سیدھی راہ پر

ہے‘‘۔(الانعام:116)

معلوم ہوا کہ حق و باطل کی پہنچان فقط اللہ کا کلام ہے لوگوں کی اکثریت حق کا معیار نہیں بلکہ قرآن تو یہاں بہت سخت بات کہ رہا ہے اور یہ مغربی جمہوریت کے بھی خلاف ہے۔یوں ہم اکثریت کو معیار نہیں بنا سکتے۔ہاں البتہ ہم اکثریت سے رائے لے کر فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور ایسا کرنا ممنوع نہیں۔ایک راز کی بات پیش خدمت ہے کہ اسلامی جمہوریت میں بھی رائے سے مراد مشورہ اور شورائیت ہے لیکن پڑھے لکھے اور متقی کی رائے۔یعنی اہل علم اور اہل تقویٰ ہی صحیح رائے دے سکتے ہیں۔اَن پڑھ، جاہل اور علم سے بے بہرہ اشخاص کی رائے اسلام میں کوئی وقعت واہمیت نہیں رکھتی۔یہاں پر رائے تولی جاتی ہے جبکہ مغربی جمہوریت میں رائے گنی جاتی ہے۔

حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

جمہوریت اک طرز حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

بحیثیت مسلمان ہمیں علامہ اقبالؒ کا یہ مشورہ ہے:

گریز از طرز جمہوری غُلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

یعنی اگر دو سو گدھے بھی مل بیٹھیں تو ایک انسان کے برابر نہیں بنتے۔قرآن یہی بات زور دے کر کہتا ہے۔اس بات کو سمجھانے کے لئے جمہوریت کی حقیقت کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے۔

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو ستبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

اس جمہوریت کی خوبی و خرابی بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ ہم دنیا میں بسنے والے ہر شخص کی بابت یقینی علم رکھتے ہیں کہ ہدایت و ضلالت کن کن لوگوں کا مقدر بنی ہے:

ان ربك هو اعلم من يضل عن سبيله وهوا اعلم بالمهتدين ۝

’’آپ کا رب ان لوگوں کو خوب جانتا ہے جو اس کی راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں اور ان سے بھی

خوب واقف ہے جو ہدایت یافتہ ہیں"۔(الانعام:117)

اس مقام پر میں ایک نکتہ واضح کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام میں اجماع کی بھی ایک کیفیت ہے جس میں یہ شرط ہے کہ اُمت میں سے راہ حق پر چلنے والے علماء اگر کسی ایک بات پر متفق ہو جائیں تو وہ ایک قانون کی شکل بن جاتی ہے مگر وہاں علماء ربانی کی اکثریت کی شرط ہے۔ کسی مادر پدر آزاد معاشرے کے بھی افراد کی اکثریت مطلوب نہیں۔

گناہ سے بیزاری

موجودہ دور میں معاشرے کی اکثریت خواہشاتِ نفسانی کی غلام اور گناہوں میں مستغرق ہے اور گناہ اس قدر قبیح اور بدتر چیز ہے کہ اُس کی ہر صورت سے بچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

وذروا ظاهر الاثم وباطنه ان الذين يكسبون الاثم سيجزون بما كانوا يقترفون ٥

"اور ظاہر و پوشیدہ (ہر طرح کا) گناہ ترک کردو۔ جو لوگ گناہ کرتے ہیں، وہ عنقریب اپنے کیے کی سزا پائیں گے"۔(الانعام:120)

گناہ انفرادی واجتماعی ہر سطح اور ہر صورت میں قبیح اور ناپسندیدہ ہے مگر معاشرے میں کچھ لوگ گناہوں کی دلدل میں ایسے پھنسے ہوئے ہیں کہ اپنی ذات کے ساتھ دوسرے لوگوں کو بھی جرائم کی دنیا میں شامل کر کے خود اس مجرم پیشہ گروہ کے سردار بن بیٹھتے ہیں۔

اللہ ربُّ العزت نے ان کو تنبیہہ کے لئے یوں خطاب کیا ہے:

وكذلك جعلنا في كل قرية اكبر مجرميها ليمكروا فيها وما يمكرون الا بانفسهم وما يشعرون ٥ (الانعام:123)

"اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں بڑے بڑے مجرم پیدا کئے کہ ان میں مکاریاں کرتے رہیں اور جو مکاریاں یہ کرتے ہیں، اس کا نقصان ان ہی کو ہے اور (اس سے) یہ بے خبر ہیں"

یہ مکار اور جرائم پیشہ لوگوں کے سربراہ معاشرتی گناہوں کے ساتھ ساتھ دینی معاملات میں بھی مجرمانہ ذہنیت رکھتے ہیں اور آسمانی تعلیمات کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیتے ہیں کہ یہ قدیم انبیاء ورسل کی تعلیمات سے متصادم تعلیمات ہیں۔

اِسلامی اخلاقیات کے چار مراتب

(سید ابوالاعلیٰ مودودی)

تقویٰ:۔

تقویٰ کی بات کرنے سے پہلے یہ سمجھنے کی کوشش کیجیے کہ تقویٰ ہے کیا چیز تقویٰ حقیقت میں کسی وضع وہیئت اور کسی خاص طرز معاشرت کا نام نہیں ہے، بلکہ دراصل وہ نفس کی اس کیفیت کا نام ہے جو خدا ترسی اور احساس ذمہ داری سے پیدا ہوتی ہے اور زندگی کے ہر پہلو میں ظہور کرتی ہے۔ حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ انسان کے دل میں خدا کا خوف ہو، عبدیت کا شعور ہو، خدا کے سامنے اپنی ذمہ داری وجواب دہی کا احساس ہو، اور اس بات کا زندہ ادراک موجود ہو کہ دنیا ایک امتحان گاہ ہے جہاں خدا نے ایک مہلتِ عمر دے کر مجھے بھیجا ہے اور آخرت میں میرے مستقبل کا فیصلہ بالکل اس چیز پر منحصر ہے کہ میں اس دیئے ہوئے وقت کے اندر اس امتحان گاہ میں اپنی قوتوں اور قابلیتوں کو کس طرح استعمال کرتا ہوں، اس سروسامان میں کس طرح تصرف کرتا ہوں جو مشیت الٰہی کی تحت مجھے دیا گیا ہے۔ اور ان انسانوں کے ساتھ کیا معاملہ کرتا ہوں جن سے قضائے الٰہی نے مختلف حیثیتوں سے میری زندگی متعلق کردی ہے۔ یہ احساس وشعور جس شخص کے اندر پیدا ہوجائے اس کا ضمیر بیدار ہوتا ہے۔ اس کی دینی حس تیز ہوجاتی ہے۔ اس کو وہ ہر چیز کھٹکنے لگتی ہے جو خدا کی رضا کے خلاف ہو۔ اس کے مذاق کو ہر وہ شے ناگوار ہونے لگتی ہے جو خدا کی پسند سے مختلف ہو وہ اپنے نفس کا آپ جائزہ لینے لگتا ہے کہ میرے اندر کس قسم کے رجحانات ومیلانات پرورش پارہے ہیں۔ وہ اپنی زندگی کا خود محاسبہ کرنے لگتا ہے کہ میں کن کاموں میں اپنا وقت اور اپنی قوتیں صرف کررہا ہوں۔ وہ صریح ممنوعات تو درکنار مشتبہ امور میں بھی مبتلا ہوتے ہوئے خود بخود جھجکنے لگتا ہے اس کا احساس فرض اسے مجبور کردیتا ہے کہ تمام اوامر کو پوری فرماں برداری کے ساتھ بجالائے۔ اس کی خدا ترسی ہر اس موقع پر اس کے قدم میں لرزش پیدا کردیتی ہے جہاں حدود اللہ سے تجاوز کا اندیشہ ہو، حقوق اللہ اور حقوق العباد کی نگہداشت آپ سے آپ اس کا وطیرہ بن جاتی ہے اور اس خیال سے بھی اس کا ضمیر کانپ اٹھتا ہے کہ کہیں اس سے کوئی بات حق کے خلاف سرزد نہ ہوجائے۔ یہ کیفیت کسی ایک شکل یا کسی مخصوص دائرہ میں ہی ظاہر نہیں ہوتی بلکہ آدمی کے پورے طرز فکر اور اس کے تمام کارنامہء زندگی میں اس کا ظہور ہوتا ہے، اور اس کے اثر

سے ایک ایسی ہموار و یک رنگ سیرت پیدا ہوتی ہے جس میں آپ ہر پہلو سے ایک ہی طرز کی پاکیزگی وصفائی پائیں گے۔ بخلاف اس کے جہاں تقویٰ بس اسی چیز کا نام رکھ لیا گیا ہے کہ آدمی چند مخصوص شکلوں کی پابندی اور مخصوص طریقوں کی پیروی اختیار کرے اور مصنوعی طور پر اپنے آپ کو ایسے سانچے میں ڈھال لے جس کی پیمائش کی جا ہو سکتی ہو۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ وہ چند اشکال تقویٰ جو سکھا دی گئی ہیں ان کی پابندی تو انتہائی اہتمام کے ساتھ ہو رہی ہے، مگر اس کے ساتھ زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں وہ اخلاق، وہ طرز فکر اور وہ طرز عمل بھی ظاہر ہو رہے ہیں جو مقام تقویٰ تو درکنار، ایمان کے ابتدائی مقتضیات سے بھی مناسبت نہیں رکھتے، یعنی حضرت مسیح کی تمثیلی زبان میں مچھر چھانے جا رہے ہیں اور اونٹ بے تکلفی کے ساتھ نگلے جا رہے ہیں۔

حقیقی تقویٰ اور مصنوعی تقویٰ کے اس فرق کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص تو وہ ہے جس کے اندر طہارت و نظافت کی حس موجود ہے اور پاکیزگی کا ذوق پایا جاتا ہے ایسا شخص گندگی سے فی نفسہ نفرت کرے گا۔ خواہ اس کے اندر طہارت کی حس موجود نہیں ہے مگر وہ گندگیوں اور طہارتوں کی ایک فہرست لیے پھرتا ہے جو کہیں سے اس نے نقل کر لی ہیں۔ یہ شخص ان گندگیوں سے تو سخت اجتناب کرے گا جو اس نے فہرست میں لکھی ہوئی پائی ہیں، مگر بے شمار ایسی گھناؤنی چیزوں میں آلودہ پایا جائے گا جو اُن گندگیوں سے بدرجہا زیادہ ناپاک ہوں گی جن سے وہ بچ رہا ہے، صرف اس وجہ سے کہ وہ اس فہرست میں درج ہونے سے رہ گئیں۔ یہ فرق جو میں آپ سے عرض کر رہا ہوں، یہ محض ایک نظری فرق نہیں ہے بلکہ آپ اس کو اپنی آنکھوں سے ان حضرات کی زندگیوں میں دیکھ سکتے ہیں جن کے تقویٰ کی دھوم مچی ہوئی ہے۔ ایک طرف ان کے ہاں جزئیات شرع کا یہ اہتمام ہے کہ ڈاڑھی ایک خاص مقدار سے کچھ بھی کم ہو تو فسق کا فیصلہ نافذ کر دیا جاتا ہے۔ پائنچہ ٹخنے سے ذرا نیچے ہو جائے تو جہنم کی وعید سنا دی جاتی ہے۔ اپنے مسلک فقہی کے مسلمانوں کی پوری زندگی کا مدار انھوں نے رخصتوں اور سیاسی مصلحتوں پر رکھ دیا ہے، اقامت دین کی سعی سے گریز کی بے شمار راہیں انہوں نے نکال رکھی ہیں، غلبہ ءکفر کے تحت اسلامی زندگی، کے نقشے بنانے ہی میں اُن کی ساری محنتیں اور کوششیں صرف ہو رہی ہیں اور انہی کی غلط رہنمائی نے مسلمانوں کو اس چیز پر مطمئن کیا ہے کہ ایک غیر اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے، بلکہ اس کی خدمت کرتے ہوئے بھی ایک محدود دائرے میں مذہبی زندگی بسر کر کے وہ دین کے سارے تقاضے پورے

کرسکتے ہیں۔اس سے آگے کچھ مطلوب نہیں ہے جس کے لیے وہ سعی کریں۔ پھر اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ اگر کوئی ان کے سامنے دین کے اصلی مطالبے پیش کرے اور سعی اقامت دین کی طرف توجہ دلائے تو صرف یہی نہیں کہ وہ اس کی بات ان سنی کر دیتے ہیں، بلکہ کوئی حیلہ، کوئی بہانہ اور کوئی چال ایسی نہیں چھوڑتے، جو اس کام سے خود بچنے اور مسلمانوں کو بچانے کے لیے استعمال نہ کریں۔اس پر بھی ان کے تقوی پر کوئی آنچ نہیں آتی اور نہ مذہبی ذہنیت رکھنے والوں میں سے کسی کو یہ شک ہوتا ہے کہ ان کے تقوی میں کوئی کسر ہے، اسی طرح حقیقی اور مصنوعی تقوی کا فرق بیشمار شکلوں میں ظاہر ہوتا رہتا ہے مگر آپ اسے تب ہی محسوس کرسکتے ہیں کہ تقوی کا اصلی تصوّر آپ کے ذہن میں واضح طور پر موجود ہو۔

میری ان باتوں کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وضع قطع، لباس اور معاشرت کے ظاہری پہلوؤں کے متعلق جو آداب واحکام حدیث سے ثابت ہیں میں ان کا استخفاف کرنا چاہتا ہوں یا انہیں غیر ضروری قرار دیتا ہوں۔خدا کی پناہ اس سے کہ میرے دل میں ایسا کوئی خیال ہو۔ دراصل جو کچھ میں آپ کے ذہن نشین کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اصل شے حقیقت تقوی ہے نہ کہ مظاہر، حقیقت تقوی جس کے اندر پیدا ہوگی اس کی پوری زندگی ہمواری و یک رنگی کے ساتھ اسلامی زندگی بنے گی۔اسلام اپنی پوری ہمہ گیری کے ساتھ اس کے خیالات میں، اس کے جذبات ورجحانات میں، اس کے مذاق طبیعت میں اس کے اوقات کی تقسیم اور اس کی قوتوں کے مصارف میں اس کی سعی کی راہوں میں، اس کے طرز زندگی اور معاشرت میں، اس کی کمائی اور خرچ میں، غرض اس کی حیات دنیوی کے سارے ہی پہلوؤں میں رفتہ رفتہ نمایاں ہوتا چلا جائے گا ۔بخلاف اس کے اگر مظاہر کو حقیقت پر مقدم رکھا جائیگا اور ان پر بیجا زور دیا جائے گا اور حقیقی تقوی کی تخم ریزی اور آبیاری کے بغیر مصنوعی طور پر چند ظاہری احکام کی تعمیل کرادی جائے گی، تو نتائج وہی کچھ ہوں گے جن کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے پہلی چیز دیر طلب اور صبر آزما ہے، بتدریج نشوونما پاتی اور ایک مدت کے بعد برگ وبار لاتی ہے، جس طرح بیج سے درخت کے پیدا ہونے اور پھل پھول لانے میں کافی دیر لگا کرتی ہے۔اسی لیے سطحی مزاج کے لوگ اس سے اُوپر آتے ہیں۔بخلاف اس کے دوسری چیز جلدی اور آسانی سے پیدا کرلی جاتی ہے جیسے ایک لکڑی

میں پتے اور پھل اور پھول باندھ کر درخت کی سی شکل بنادی جائے۔یہی وجہ ہے کہ تقویٰ کی پیداوار کا یہی ڈھنگ آج مقبول ہے لیکن ظاہر ہے کہ جو توقعات ایک فطری درخت سے پوری ہوتی ہیں وہ اس قسم کے مصنوعی درختوں سے تو کبھی پوری نہیں ہوسکتیں۔

احسان

اب احسان کو لیجیے جو اسلام کی بلند ترین منزل ہے۔احسان دراصل اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور اس کے دین کے ساتھ قلبی لگاؤ، اس کی گہری محبت، اس سچی وفاداری اور فدویت و جاں نثاری کا نام ہے جو مسلمان کو فنافی الاسلام کردے۔تقویٰ کا اساسی تصور خدا کا خوف ہے جو انسان کو اس کی ناراضی سے بچنے پر آمادہ کرے اور احسان کا اساسی تصور خدا کی محبت ہے، جو آدمی کو اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اُبھارے۔ان دونوں چیزوں کے فرق کو ایک مثال سے یوں سمجھئے کہ حکومت کے ملازموں میں سے ایک تو وہ لوگ ہیں جو نہایت فرض شناسی وتن دہی سے تمام خدمات ٹھیک ٹھیک بجالاتے ہیں جو ان کے سپرد کی گئی ہوں۔تمام ضابطوں اور قاعدوں کی پوری پوری پابندی کرتے ہیں اور کوئی کام ایسا نہیں کرتے جو حکومت کے لیے قابل اعتراض ہو۔ دوسرا طبقہ اُن مخلص وفاداروں اور جاں نثاروں کا ہوتا ہے جو دل و جان سے حکومت کے ہوا خواہ ہوتے ہیں۔صرف وہی خدمات انجام نہیں دیتے جو ان کے سپرد کی گئی ہوں، بلکہ ان کے دل کو ہمیشہ یہ فکر لگی رہتی ہے کہ سلطنت کے مفاد کو زیادہ سے زیادہ کس طرح ترقی دی جائے۔اس دھن میں وہ فرض اور مطالبہ سے زائد کام کرتے ہیں۔سلطنت پر کوئی آنچ آئے تو وہ جان و مال اور اولاد سب کچھ قربان کرنے کے لیے آمادہ ہوجاتے ہیں۔قانون کی کہیں خلاف ورزی ہو تو ان کے دل کو چوٹ لگتی ہے کہیں بغاوت کے آثار پائے جائیں تو وہ بے چین ہوجاتے ہیں اور اسے فرو کرنے میں جان لڑادیتے ہیں۔جان بوجھ کر خود سلطنت کو نقصان پہنچانا تو درکنار اس کے مفاد کو کسی طرح نقصان پہنچتے دیکھنا بھی ان کے لیے ناقابل برداشت ہوتا ہے اور اس خرابی کو رفع کرنے میں وہ اپنی حد تک کوشش کا کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھتے اُن کی دلی خواہش یہ ہوتی ہے کہ دنیا میں بس ان کی سلطنت ہی کا بول بالا ہو اور زمین کا کوئی چپہ ایسا باقی نہ رہے جہاں اُس کا پھریرا نہ اڑے۔ان دونوں میں سے پہلی قسم کے لوگ اس حکومت کے متقی ہوتے ہیں اور دوسری قسم کے

لوگ اس کے محسن۔ اگرچہ ترقیاں متقین کو بھی ملتی ہیں اور بہر حال اُن کے نام اچھے ہی ملازموں کی فہرست میں لکھے جاتے ہیں مگر جو سرفرازیاں محسنین کے لیے ہیں ان میں کوئی دوسرا ان کا شریک نہیں ہوتا۔ بس اسی مثال پر اسلام کے متقیوں اور محسنوں کو بھی قیاس کر لیجئے۔ اگرچہ متقین بھی قابل قدر اور قابل اعتماد لوگ ہیں، مگر اسلام کی اصلی طاقت محسنین کا گروہ ہے۔ اصلی کام جو اسلام چاہتا ہے کہ دنیا میں ہو وہ اسی گروہ سے بن آسکتا ہے۔

احسان کی اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد آپ خود ہی اندازہ کر لیں کہ جو لوگ اپنی آنکھوں سے خدا کے دین کو کفر سے مغلوب دیکھیں، جن کے سامنے حدود اللہ پامال ہی نہیں بلکہ کالعدم کر دی جائیں، خدا کا قانون عملاً ہی نہیں بلکہ باضابطہ منسوخ کر دیا جائے، خدا کی زمین پر خدا کا نہیں بلکہ اس کے باغیوں کا بول بالا ہو رہا ہو، نظام کفر کے تسلط سے نہ صرف عام انسانی سوسائٹی میں اخلاقی وتمدنی فساد برپا ہو بلکہ خود اُمت مسلمہ بھی نہایت سرعت کے ساتھ اخلاقی و عملی گمراہیوں میں مبتلا ہو رہی ہو، اور یہ سب کچھ دیکھ کر بھی اُن کے دلوں میں نہ کوئی بے چینی پیدا ہو، نہ اس حالت کو بدلنے کے لیے کوئی جذبہ بھڑکے، بلکہ اس کے برعکس وہ اپنے نفس کو اور عام مسلمانوں کو غیر اسلامی نظام کے غلبے پر اصولاً و عملاً مطمئن کر دیں، ان کا شمار آخر محسنین میں کس طرح ہو سکتا ہے؟ اس جرم عظیم کے ساتھ محض یہ بات انہیں احسان کے مقام عالی پر کیسے سرفراز کر سکتی ہے کہ وہ چاشت اور اشراق اور تہجد کے نوافل پڑھتے رہے، جزئیات فقہ کی پابندی اور چھوٹی چھوٹی سنتوں کے اتباع کا سخت اہتمام فرماتے رہے اور تزکیہ نفس کی خانقاہوں میں دینداری کا وہ فن سکھاتے رہے جس میں حدیث وفقہ اور تصوف کی باریکیاں تو ساری موجود تھیں مگر ایک نہ تھی تو وہ حقیقی دینداری جو "سر داد نہ داد دست در دست یزید" کی کیفیت پیدا کرے اور بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا،، کے مقام وفاداری پر پہنچا دے، آپ دنیوی ریاستوں اور قوموں میں بھی وفادار اور غیر وفادار کی اتنی تمیز ضرور نمایاں پائیں گے کہ اگر ملک میں بغاوت ہو جائے یا ملک کے کسی حصے پر دشمن کا قبضہ ہو جائے تو باغیوں اور دشمنوں کے تسلط کو جو لوگ جائز تسلیم کر لیں یا ان کے تسلط پر راضی ہو جائیں اور ان کے ساتھ مغلوبانہ مصالحت کر لیں، یا ان کی سرپرستی میں کوئی ایسا نظام بنائیں جس میں اصلی اقتدار کی باگیں انہی کے ہاتھ میں رہیں اور کچھ ضمنی حقوق اور اختیارات

انہیں بھی مل جائیں تو ایسے لوگوں کو کوئی ریاست اور کوئی قوم اپنا وفادار ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتی۔ خواہ وہ قومی فیشن کے کیسے ہی سخت پابند اور جزئی معاملات میں قومی قانون کے کتنے ہی شدید پیرو ہوں۔ آج آپ کے سامنے زندہ مثالیں موجود ہیں کہ جو ملک جرمنی کے تسلط سے نکلے ہیں۔ وہاں ان لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ ہو رہا ہے جنہوں نے جرمن قبضے کے زمانے میں تعاون ومصالحت کی راہیں اختیار کی تھیں۔ ان سب ریاستوں اور قوموں کے پاس وفاداری کو جانچنے کا ایک ہی معیار ہے اور وہ یہ ہے کہ کسی شخص نے دشمن کے تسلط کی مزاحمت کس حد تک کی، اس کو مٹانے کے لئے کیا کام کیا اور اس اقتدار کو واپس لانے کی کیا کوششیں کی جس کی وفاداری کا وہ مدعی تھا۔ پھر کیا معاذ اللہ خدا کے متعلق آپ کا یہ گمان ہے کہ وہ اپنے وفاداروں کو پہچاننے کی اتنی تمیز بھی نہیں رکھتا جتنی دنیا کے اُن کم عقل انسانوں میں پائی جاتی ہے؟ کیا آپ سمجھتے ہیں کہ وہ بس ڈاڑھیوں کا طول، ٹخنوں اور پانچوں کا فاصلہ، تسبیحوں کی گردش، اوراد و وظائف اور نوافل اور مراقبے کے مشاغل اور ایسی ہی چند اور چیزیں دیکھ کر ہی دھوکا کھا جائے گا کہ آپ اس کے سچے وفادار اور جاں نثار ہیں؟ (جاری ہے)

سالانہ اِجتماع

15,14,13 اپریل 2007ء

بروز جمعہ، ہفتہ اور اتوار کو ہوگا

وصف الکبر

(پروفیسر یوسف سلیم چشتیؒ)

میں نے پوچھا کہ وہ تکبر کون سا ہے جو خود پسندی سے پیدا ہوتا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ وہ تکبر جو خود پسندی سے پیدا ہوتا ہے وہ دین کے امور میں علم اور عمل سے پیدا ہوتا ہے۔ علم کی جہت سے تو اس طرح کہ جب عالم اپنے علم سے خوش ہوتا ہے تو یہ خوشی اسے تکبر تک لے جاتی ہے۔ پس وہ عوام کے مقابلے میں تکبر کرنے لگتا ہے حالانکہ یہ ممکن ہے کہ عوام میں بعض لوگ اُس سے زیادہ متقی ہوں اور یہی وہ بات ہے جس کی طرف سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ نے اشارہ فرمایا کہ مجھے علماء کے بارے میں اس بات کا خوف ہے کہ مبادا علم کی وجہ سے ان میں تکبر پیدا ہو جائے پس علماء کو لازم ہے کہ متعلم کے سامنے تواضع اختیار کریں اور جابر علماء میں شامل نہ ہوں، کیونکہ خدا کے نزدیک تمہارا علم تمہارے جہل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا (مطلب یہ ہے کہ خواہ انسان کتنا ہی بڑا عالم کیوں نہ ہو پھر بھی بہت سی باتیں ایسی ہیں جنہیں وہ نہیں جانتا)۔

پس جب ایک عالم تکبر کرتا ہے اور جو لوگ علم میں اس سے کمتر ہیں انہیں ذلیل سمجھتا ہے ان سے دور رہتا ہے، انہیں ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے ان سے خادموں کی طرح خدمت لیتا ہے، تعلیم پر احسان جتاتا ہے، اُن کے مقابلے میں بڑا بنتا ہے، ان سے کشیدہ رہتا ہے تا کہ وہ اسے سلام کریں، ان کا مذاق اُڑاتا ہے، اگر وہ اس کی تعظیم میں کوتاہی کریں تو ان سے ناراض ہو جاتا ہے۔ ان تمام باتوں کی اصلی وجہ تکبر ہے یعنی وہ یہ سمجھتا ہے کہ ان پر اس کا یہ حق ہے کہ وہ اس کی تعظیم کریں۔ تکبر ہی کی وجہ سے مناظرے میں فریق مخالف کی حق بات کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اسے منطقی بحثوں میں الجھا دیتا ہے۔ اگر کبھی وعظ کرتا ہے تو لوگوں پر تشدد کرتا ہے اور اگر کوئی اسی نصیحت کرے تو تکبر ہی کی بنا پر غضبناک ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت معاذؓ نے یہی بات آنحضرت ﷺ سے نقل فرمائی ہے کہ: علماء میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جب وعظ کہتے ہیں تو ناک چڑھا کر کہتے ہیں اور اگر انہیں نصیحت کی جائے تو تشدد پر اتر آتے ہیں، اور اگر ان کے حق میں کمی ہو جائے یا ان کی بات رد کر دی جائے تو غضب ناک ہو جاتے ہیں۔

اس حدیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ علماء کے سات طبقے ہیں کیونکہ عالم یہ سمجھتا ہے کہ میں عوام سے برتر ہوں اور عوام مجھ سے کمتر ہیں، وہ عوام کی بات قبول نہیں کرتا نہ ان کی نصیحت قبول

کرتا ہے۔انہیں علم سکھانے میں یا وعظ میں نرمی برتنے سے شرم محسوس کرتا ہے اور ان کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے بات نہیں کرتا کیونکہ اس کے نزدیک عوام اس جیسے نہیں ہیں۔ وہ انہیں بھی حقیر سمجھتا ہے جو تقوٰی میں اس سے کمتر ہیں اور انہیں بھی جو تقوٰی میں اس سے برتر ہیں۔انہیں ایسی حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے جیسے وہ گدھے ہوں جن کو عقل نہیں ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ میرا علم اس قدر ارفع ہے کہ عوام اُس سے استفادہ نہیں کر سکتے اور اگر کوئی شخص اس کے علم سے فائدہ حاصل کرے تو بھی اسے حقیر ہی سمجھتا ہے۔

یہ سب باتیں اس بنا پر پیدا ہوتی ہیں کہ متکبر جاہل باللہ ہوتا ہے اور عوام اس سے زیادہ عالم باللہ ہوتے ہیں کیونکہ وہ اللہ سے ڈرتے ہیں۔ وہ عالم کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں مگر عالم ان کو ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے۔حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ (عالم متکبر) خود ذلیل ہے اور وہ (عوام) سربلند ہیں جو تواضع اختیار کیے ہوئے ہیں۔یاد رکھو! باری تعالیٰ اسی کو حقیر کو دیتا ہے جو تکبر کرتا ہے اور اسے سربلند کر دیتا ہے جو تواضع اختیار کرتا ہے۔ یہ شخص عوام کو حقیر جانتے ہوئے تکبر کرتا ہے یعنی اپنے علم پر فخر کرتا ہے اور انہیں ان کی جہالت پر عار دلاتا ہے ان کے حقوق تلف کرتا ہے، ان پر احسان جتاتا ہے۔ پس یہ شخص علم کے اعتبار سے جبار ہے اور متواضع نہیں ہے۔

ان علماء میں بعض ایسے ہیں جو ان عادتوں میں سے بعض عادتوں سے بچتے ہیں اور بعض عادتوں کی وجہ سے تکبر اختیار کیے رہتے ہیں تو جسے علم میں سے کچھ بھی عنایت ہوا ہو اسے اپنے سے کمتر لوگوں کے ساتھ تکبر کی کیفیت پیش آ ہی جاتی ہے اور بعض ایسے ہیں جو اپنے علم کے بارے میں انتہائی درجے کا تکبر اختیار کرتے ہیں۔

میں نے کہا: علم تو بندے میں تواضع بڑھاتا ہے لیکن اس تصریح سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علم جہالت اور تکبر میں اضافہ کر دیتا ہے، انہوں نے جواب دیا کہ علم کی حالت ایسی ہے جیسی حضرت وہبؒ کے اس قول سے عیاں ہے کہ علم بارش کی طرح ہے کہ آسمان سے تو صاف اور میٹھا پانی اترتا ہے اور سب درخت اس پانی سے سیراب ہوتے ہیں مگر تمام درخت اس پانی کو ذائقے پر لے آتے ہیں جو ان کا ذاتی ذائقہ ہوتا ہے۔

چنانچہ جو درخت کڑوا ہوتا ہے اس کی تلخی بڑھ جاتی ہے اور جو میٹھا ہوتا ہے اس کی مٹھاس بڑھ جاتی ہے۔ بارش کی تری شیریں درخت میں شیریں پانی پیدا کر دیتی ہے اور تلخ درخت میں تلخ

پانی، اسی طرح لوگ علم حاصل کرتے ہیں تو علم ان کی ہمتوں اور خواہشات کی مقدار میں اضافہ کردیتا ہے لہٰذا متکبر کا تکبر اور بڑھ جاتا ہے کیونکہ اس کی طبیعت پہلے ہی سے تکبر کی طرف مائل اور متوجہ تھی ۔ایسا شخص دراصل جاہل ہے ۔ جب اس نے علم حاصل کیا تو گویا وہ سامان حاصل کیا جس سے وہ تکبر کر سکے تو لامحالہ اس میں تکبر ہی پیدا ہوگا ۔لیکن ایک جاہل شخص جو خدا سے ڈرتا ہو اور جانتا ہو کہ حق تعالیٰ کی حجت بندے پر لازم ہوتی ہے چاہے وہ یہ کہتا رہے کہ میں واقف نہ تھا ،تو جب وہ اس ڈر سے علم حاصل کرتا ہے تو اس کے علم اس کے خوف میں اضافہ کردے گا اور اس میں دردمندی پیدا ہوجائے گی ،جیسا کہ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ جس کے علم میں اضافہ ہوگا اس میں دردمندی اور بڑھ جائے گی کیونکہ اس کے نزدیک باری تعالیٰ حجت عظیم ہے ۔اس لیے اس کی تواضع اور خشیت میں اضافہ ہوجائے گا۔

اور اگر اس کی توجہ اور خواہش ،دنیاوی عزت اور عظمت حاصل کرتی تھی تو علم سے تکبر ہی بڑھے گا اور وہ اپنے سے کمتر لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھے گا ۔اس کی خواہش ہمیشہ یہی ہوگی کہ میں دوسروں پر غالب رہوں اس لیے اپنی جیسی اور اپنے ستے بہتر سب باتوں کا رد کرے گا۔

میں نے عرض کی کہ عمل والے شخص کو تکبر کی کیا کیا چیزیں پیش آتی ہیں خواہ وہ عالم ہو یا نہ ہو؟ فرمایا اسے یہ چیزیں پیش آتی ہیں کہ وہ اس شخص کو جو عمل میں اس سے کمتر ہو ذلیل سمجھنے لگتا ہے چاہے وہ اس سے زیادہ عالم ہو یا اس سے زیادہ جاہل ہو ۔اگر اس سے زیادہ جاہل ہے تو یہ اپنے دل میں کہتا ہے کہ یہ شخص تو اپنے میں سوچتا ہے کہ اس کے ذمے خدا کے احکام زیادہ ہیں لیکن وہ عمل رائیگاں جانے دیتا ہے ۔ یہ شخص بھی ان لوگوں کو جو عمل مین کمتر ہوتے ہیں حقیر جانتا ہے اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے ،ان کے سامنے تکبر کا اظہار کرتا ہے ،ان سے کشیدہ رہتا ہے تاکہ وہ لوگ اسے سلام کریں ،اس کی عزت کریں اور اِسے بڑا سمجھیں ۔ یہ شخص نہ سلام میں سبقت کرتا ہے نہ کسی سے ملنے جاتا ہے ۔دوسرے لوگ خود اس سے ملنے آجائیں تو آجائیں ۔ جب وہ بیمار پڑتا ہے تو دوسرے لوگ اس کی مزاج پرسی کے لیے اس کے پاس آتے ہیں مگر جب وہ بیمار پڑتے ہیں تو یہ ان کی مزاج پرسی کے لیے کبھی نہیں جاتا ۔ گویا یہ چاہتا ہے کہ دوسروں کے

مقابلے میں اپنی فضیلت کو قائم رکھے۔ یہ شخص دوسروں کو جب چاہتا ہے جھڑک دیتا ہے اور ان سے اپنی خدمت لیتا ہے۔ جو لوگ اس کے پاس آتے ہیں ان پر اپنی علمیت کا سکہ جماتا ہے اور در پردہ ان کا مذاق اڑاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اسے نصیحت کرے تو ناک بھوں چڑھاتا ہے کیونکہ یہ شخص اپنے آپ کو بلحاظ عمل دوسروں سے ارفع سمجھتا ہے اور وہ لوگ اس کی نظر میں اپنے اوقات ضائع کر رہے ہیں۔ یہ شخص اگر کسی کو سلام کرنے میں سبقت کرے یا کسی سے سیدھے منہ بات کرے یا کسی کے ساتھ تھوڑی دیر کے لیے مجالست کرے یا کسی کی دعوت قبول کرے یا کسی سے محبت آمیز لہجے میں بات کرے تو یہ سمجھتا ہے کہ اس نے دوسروں پر احسان کیا ہے اور ان کے ساتھ ایسا معاملہ کیا ہے جس کے وہ مستحق نہ تھے۔ اپنے حق میں خدا سے وہ وہ امیدیں رکھتا ہے جو دوسروں کے لیے نہیں رکھتا۔ ان کے حق میں خدا کی گرفت کا زیادہ خوف رکھتا ہے اور اپنے حق میں بہت کم خوف رکھتا ہے۔ جب وہ دوسروں کو دیکھتا ہے یا دوسرے اسے یاد آتے ہیں یا دوسروں کو نصیحت کرتا ہے تو اپنے بارے میں اسے کوئی اندیشہ ہی نہیں ہوتا۔ اور یہی سمجھتا ہے کہ ڈرنا تو دوسروں کو چاہیے (کیونکہ وہ اعمال میں کمتر ہیں) اسے اپنے بارے میں کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ گویا اسے اس بات کا پروانہ مل گیا ہے کہ اسے عذاب نہ ہوگا۔ حالانکہ یہ اطمینان ہی سب سے زیادہ وجہ ہلاکت ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ رسول اللہ ﷺ سے نقل فرماتے ہیں کہ آپ (ﷺ) نے فرمایا کہ جب تم کسی سے یہ سنو کہ وہ یہ کہتا ہے کہ لوگ برباد ہو گئے تو دراصل اسی شخص نے لوگوں کو برباد کیا۔ اور بلاشبہ آپ (ﷺ) کا یہ ارشاد سچا ہے کیونکہ یہ بات وہی کہے گا جو متکبر ہے اور اللہ کی مخلوق کو حقیر سمجھتا ہے۔ خدا کی گرفت سے بے خبر ہے اور اس سے بے خوف ہے۔ اس کے تکبر نے اسے ان اخلاق ذمیمہ تک پہنچا دیا۔ اسی طرح رسول ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا ہے کہ ایک شخص کے لیے برائی کی یہی بات کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔

جب اس کی یہ حالت ہو اور اس سے کمتر لوگوں کی یہ حالت ہو کہ وہ اپنے بارے میں زیادہ خوف رکھتے ہوں اور اسے یہ سمجھتے ہوں کہ یہ تو واقعی نجات پانے والا ہے اور ہم تو واقعی برباد ہو گئے اور

انہیں یہ توقع ہو کہ اللہ کے یہاں اس کو ہم سے زیادہ ملے گا تو ایسی صورت میں حقیقت حال یہ بنی کہ اس سے کمتر لوگ اللہ کی زیادہ اطاعت اور عبادت کرنے والے ہوئے اور یہ شخص باری تعالیٰ کے غضب کا اور آخرت میں عذاب الیم کا زیادہ مستحق ہوا۔ یہ شخص اس درجے میں گر گیا کہ باری تعالیٰ اس سے وہ عمل سلب کر لیں جس کی بنا پر وہ دنیا میں لوگوں پر اپنی بزرگی جتایا کرتا تھا اور اپنی بڑائی بیان کرتا تھا۔ اور یہ باری تعالیٰ کی رحمت کے مستحق ہو گئے کیونکہ یہ لوگ اپنے آپ کو حقیر سمجھتے تھے اور تواضع اختیار کیے ہوئے تھے۔ اس (متکبر) کی تعظیم کرتے تھے اور اس سے محبت رکھتے تھے اور وہ اس (متکبر) سے محض اس لیے محبت کرتے تھے کہ اس طرح انہیں اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا۔ اگر ان کے دل میں خدا کی محبت اور عظمت نہ ہوتی تو وہ لوگ نہ اس (متکبر) سے محبت کرتے نہ اس کی عزت کرتے۔ پس ان کی محبت حب الٰہی کی وجہ سے ہوئی اور اس اُمید پر تھی کہ اس طرح باری تعالیٰ کا قرب حاصل ہوگا تو بلا شبہ ان لوگوں کو حق تعالیٰ اپنی رحمت اور مغفرت سے نوازیں گے اور عبادت و ریاضت میں اِس شخص کے مقام پر پہنچا دیں گے اور یہ شخص اپنے تکبر کی وجہ سے اس مقام پر پہنچ گیا کہ اس کے سارے اعمال اکارت چلے جائیں گے، اور اس کو بدترین حالت میں ڈال دیا جائے گا کیونکہ خدا تعالیٰ نے اِسے عمل صالح کی توفیق دے کر اس پر جو احسان فرمایا تھا اس نے شکر ادا کرنے کے بجائے اِس پر تکبر شروع کر دیا اور اپنے مقابلے میں اللہ کے بندوں کو ذلیل سمجھا اور انہیں حقارت کی نظر سے دیکھا۔

بلا شبہ اِس کی حالت ایسی ہوگی جیسی حضرت شعبیؒ سے منقول ہے اور اسی طرح کا واقعہ ابوالجلا بن ایوبؒ سے بھی منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جسے خلیع بنی اسرائیل کہتے تھے (بنی اسرائیل کا نکالا ہوا)۔ یہ شخص ایک عابد کے پاس سے گزرا، دیکھا کہ بادل اس کے سر پر سایہ کیے ہوئے ہیں۔ یہ دیکھ کر اپنے دل میں کہنے لگا کہ میں تو راندہ بنی اسرائیل ہوں اور یہ شخص ان میں عابد اور زاہد ہے۔ اگر میں اس کے قریب بیٹھ جاؤں تو ہو سکتا ہے کہ باری تعالیٰ اس کی وجہ سے مجھ پر بھی رحم فرمائے۔ یہ سوچ کر اس کی مجلس میں بیٹھ گیا۔ دوسری طرف عابد نے اپنے دل میں کہا کہ میں بنی اسرائیل میں عابد و زاہد شخص ہوں اور یہ شخص تو راندہ قوم ہے پس کیسے ہو سکتا ہے

کہ یہ شخص میرے پاس بیٹھے۔ یہ خیال کر کے اِس نے، اس سے کہا کہ ''میرے پاس سے اُٹھ جا''
اس پر اللہ تعالیٰ نے اس عہد کے نبیؑ پر وحی بھیجی کہ ان دونوں کو حکم دیجئے کہ از سرِ نو عمل شروع
کریں۔ فی الحال میں نے اِس مردود القوم کی مغفرت کردی اور اِس عابد کا عمل حبط (اکارت) کر
دیا۔ اِس کے بعد وہ بادل اُس مغفور انسان کے سر پر سایہ فگن ہوگیا۔

اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ بندوں سے ان کے دل کی
کیفیت چاہتے ہیں۔ اعضاء و جوارح ہمیشہ دلوں کے تابع ہوتے ہیں۔ جب عالم یا عابد تکبر
کرنے لگے اور جاہل یا گنہگار تواضع اختیار کرلے اور حق تعالیٰ کی ہیبت کے سامنے اپنے آپ کو
ذلیل وخوار سمجھے تو درحقیقت یہی گنہگار آدمی دل سے اللہ تعالیٰ کا مطیع ہوگیا اور متکبر عالم یا عابد سے
بڑھ گیا۔ اِسی قبیل سے یہ حدیث یا روایت ہے کی بنی اسرائیل میں ایک شخص تھا جو اپنی قوم کے
ایک عابد اور زاہد کی خدمت میں گیا اور اس کی گردن پر پاؤں رکھ دیا اور کہا کہ اپنا سر اُٹھا۔ عابد نے
جواب دیا کہ ''اللہ کی قسم! اللہ تیری بخشش نہیں کرے گا''۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ اے وہ
شخص جو میری قسم کھاتا ہے! دراصل تو ایسا ہے کہ تیری بخشش نہیں ہوگی۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ
عابد کی زبان سے یہ جملہ اِس لئے نکلا کہ وہ اپنی نظر میں، اللہ کی بارگاہ میں، اپنا مرتبہ بہت بڑا سمجھتا
تھا اور یہ گمان کرتا تھا کہ میرے ساتھ بدسلوکی، اللہ کی نگاہ میں اتنا بڑا گناہ ہے کہ کبھی معاف نہیں ہو
گا۔ بات یہ ہے کہ رات دن عبادت کی وجہ سے اِس عابد میں کبر پیدا ہوگیا تھا۔ کثرت زہد اور
کثرت سجود کی وجہ سے اس کی ذات میں دو خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ ایک خود پسندی، دوسری تکبر۔
نیز باری تعالیٰ کی قدرت کے بارے میں اسے غلط فہمی ہوگئی تھی۔

اِسی طرح وہ شخص ہے جو تکبر میں گرفتار ہوجائے اور بندوں کو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگے۔
ایسا شخص اِس مغالطے میں مبتلا ہوجاتا ہے کہ قیامت کے دن بخشش کا حق مجھ ہی کو حاصل ہوگا۔
روایت ہے کہ ایک دن حضور انور ﷺ کی مجلس میں ایک شخص کا ذکر کیا گیا۔ چند روز کے بعد وہ
شخص خدمت نبوی (ﷺ) میں حاضر ہوا تو صحابہؓ نے عرض کی کہ حضور (ﷺ) ہم نے اسی شخص
کا تذکرہ آپ (ﷺ) سے کیا تھا۔ یہ سن کر آپ (ﷺ) نے فرمایا'' میں تو اِس شخص کے

چہرے پر شیطان کے اثرات دیکھتا ہوں''۔ اسی اثناء میں وہ شخص حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آ پہنچا اور سلام کر کے صحابہؓ کی صف میں بیٹھ گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی طرف دیکھ کر فرمایا ''اے شخص! میں خدا کیلئے تجھ سے پوچھتا ہوں کہ کیا تیرے دل میں یہ خیال آیا تھا کہ حاضرین مجلس میں مجھ سے افضل کوئی شخص نہیں ہے؟ اس نے عرض کیا یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) بلاشبہ میرے دل میں یہ خیال آیا تھا۔

پس متکبر اس غلط فہمی میں مبتلا رہتا ہے کہ مجھ سے بہتر کوئی نہیں ہے اور مجھ سے زیادہ نجات کا مستحق اور کوئی نہیں ہے۔ اسی لئے وہ عوام سے علیحدہ رہتا ہے اور ان کو دیکھ کر منقبض ہو جاتا ہے۔ گویا اپنے اعمال کا ان پر احسان رکھ رہا ہے۔ جیسا کہ حارث بن جزیز زبیریؓ جو حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے صحابہؓ میں سے ہیں، فرماتے ہیں کہ مجھے قراء میں وہ شخص اچھا لگتا ہے جس کا چہرہ دل کش ہو، مسکراتا ہوا ہو، جس آدمی سے ملے تو خندہ پیشانی کے ساتھ ملے۔ اور خدا نہ کرے کہ مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کثرت ہو جو دوسروں سے بات بھی کریں تو یہ سمجھ کر کریں کہ ان پر احسان کر رہے ہیں۔ اگر باری تعالیٰ کسی شخص سے بھی اس معاملے میں راضی ہوتے تو کبھی اپنے نبی برحق و برگزیدہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ نہ فرماتے کہ۔

واخفض جناحك للمومنين (۱۵۔۸۸)

اے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) آپ مومنوں کے ساتھ (مشفقانہ) فروتنی کا اظہار کیجئے۔

نیز فرمایا:۔

فبما رحمة من الله لنت لهم (۳:۱۵۹)

یہ بھی آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اللہ کی رحمت ہے کہ آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) مومنوں کے ساتھ نرمی سے پیش آتے ہیں۔

نیز حق تعالیٰ نے اپنے اولیاء کا جن سے وہ محبت کرتا ہے اور جو اس سے محبت کرتے ہیں، یہ وصف بیان فرمایا ہے:۔

اذلة على المومنين اعزة على الكفرين ۝ (۵:۵۴)

یعنی وہ مومنوں کے ساتھ عاجزی اور فروتنی سے پیش آتے ہیں (مگر) کافروں کے مقابلے میں بہت تیز اور سخت ہیں۔

لہٰذا اللہ کے نزدیک اُس شخص کا کوئی مرتبہ نہیں ہے جو اس کے بندوں کے مقابلے میں اپنی بڑائی کا اظہار کرے چاہے وہ عابد ہو یا عالم۔ اور بعض عابدوں میں ایسے بھی ہوتے ہیں جو گمراہ بھی ہوتے ہیں اور متکبر بھی۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق ہم سے زیادہ نہ دوسرا جانتا ہے اور نہ بیان کرسکتا ہے نیز یہ کہ صحیح علم صرف ہمارے پاس ہے، اسی لئے ہمارے سوا دوسرے لوگ راہ راست پر نہیں ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ قران مخلوق ہے، یہی وہ لوگ ہیں جو توقف کے قائل ہیں، اور یہی وہ لوگ ہیں جو الفاظ قران کے حدوث کے قائل ہیں، یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں وزنِ اعمال کے منکر ہیں۔ انہی گمراہ لوگوں میں روافض بھی ہیں، انہی میں مرجیہ ہیں، انہی میں خوارج ہیں اور انہی میں وہ لوگ بھی جو شفاعت کے منکر ہیں اور حضور انور ﷺ کے صحابہؓ پر سب وشتم کرتے ہیں، اور اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں حالانکہ بفحوائے نصِ قرآنی وہ بہتان سے بری (پاک دامنہ) تھیں۔ اللہ تعالیٰ اپنی بہترین رحمتیں ان کی روح پُرفتوح پر نازل فرمائے۔

اگر طوالت کا خوف نہ ہوتا تو میں دوسرے گمراہ فرقوں کا بھی ذکر کرتا۔ فی الحال اس پر اکتفا کرتا ہوں کہ یہ مذکورہ بالا فرقے سب باطل ہیں اور دین حق سے بھاگے ہوئے اور راہ راست سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ یہ فرقے اس گمراہی میں مبتلا ہیں کہ اپنے سوا دوسروں کو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ حق بات کہہ ہی نہیں سکتے اور روئے زمین میں ہمارے سوا کوئی حق پر نہیں ہے۔ چنانچہ سیدنا ابن عباسؓ حضور انور ﷺ سے نقل کرتے ہیں کہ حضور (ﷺ) نے فرمایا کہ ایسے لوگ پیدا ہونے والے ہیں کہ وہ قرآن کی تلاوت تو کریں گے مگر وہ ان کے حلق سے نیچے نہیں اُترے گا۔ وہ کہیں گے کہ ہم سے زیادہ عالم قرآن کون ہوسکتا ہے؟ اس کے بعد حضور (ﷺ) نے اپنے صحابہؓ کی طرف متوجہ ہوکر فرمایا اے افرادِ اُمت! وہ لوگ تم میں سے ہی ہوں گے اور وہ جہنم کا ایندھن ہوں گے۔ (جاری)

ایک انقلابی صوفی

(صوفی شوکت حسین)

نہر کا پانی شفاف تھا، نہایت شفاف تھا، بلکہ شفاف ترین تھا اس لئے کہ پانی جس مرکز سے آ رہا تھا وہ "Central Point" بے مثل و بے مثال تھا۔ پانی کی تازگی و نفاست اور پاکیزگی اک قدرتی امر تھا۔

نہر بہتی رہی، عجب مستانی چال تھی۔ جس نے ایک گھونٹ پی لیا بس ساری پیاس کافور ہو گئی۔ تلخی تازگی میں بدل گئی، آگ ٹھنڈک میں تبدیل ہو گئی۔

نہر رواں دواں تھی دُنیا ٹوٹ پڑی کیونکہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ جو بھی اس کا ایک جام نوش جاں کر لے گا حیات سرمدی پالے گا۔ ہمیشگی چاہت، سدا بہار زندگی، مسرت خوشی کا کون خواہش مند نہیں ہوتا۔

عجب مستی سی تھی اِک اِک گھونٹ میں جو بھی حلق سے اُتارتا وہ بدل ہی جاتا اب آنکھیں بدلیں، ساتھ چال بھی بدل گئی، انداز تکلم بھی اور رُخ بھی تبدیل ہو گیا۔ ہے کوئی جو ان قلندروں کو روکے، نہ بابا نہ بابا، کسی کی جرات نہیں، ہمت نہیں، طاقت نہیں، ان شہزادوں کو پیچھے دھکیل سکے۔ کیوں جی؟ پانی جو نوش جان کیا اس نہر صافی کا۔ وہ کونسا جام ہے جو تم پی رہے ہو، وہ کونسے گھونٹ ہیں جو حلق سے اُتار رہے ہو، اے وہ کون سی شراب ہے جس میں اس قدر تر و تازگی، لطافت ہے، بے رنگی ہے، بے کیفی ہے، کسی کا رنگ وہ نہیں رہا جو پہلے تھا، ارے بابا عجب رنگ چڑھا! اس کو نوش کرنے سے دُنیا کے تمام رنگ اپنی رنگت کو بھول گئے، عجب کیفیت ہوئی تمہاری سارے کیف ختم ہو گئے، دنگ رہ گئے اہل زمانہ کہ ایسی لطافت، ایسی پاکیزگی، ایسی مٹھاس، ایسی کشش جو پہلے تو نہ تھی۔ ایسا قلندرانہ انداز ایسی بے پرواہی، ایسی دیوانگی جو کبھی دیکھنے میں نہ آئی۔

تحقیق جاری ہو گئی، ریسرچ سنٹر قائم ہو گئے، ساری دنیا کے دانش مند سر پکڑ کر بیٹھ گئے، بابو جی ہمارے فلسفے، ہماری زبان کی بلندی، ہماری فکر و نظر کچھ کام نہیں کر رہی۔

بڑے زور شور سے گفتگو جاری ہے، ہر اک گفتگو کرنا اپنا حق سمجھ رہا ہے، اہل مجلس سے ایک نے نعرہ لگایا ہمارے آباء کے محنت و مشقت سے کھودے ہوئے کنویں اب بے کار ہو گئے۔

ارے بابا لاؤ اُن راہوں کو وہی روشنی ڈالیں گے اس مسئلہ پر ہماری عقلمندی بے کار ہو چکی

ہے۔ راہبوں نے آنکھیں موندلیں، چلے گئے، زندگی نے وفانہ کی۔

خیر! دانشمندی آخر کام آ ہی گئی۔ لیکن جب وہ اس نہر کے کنارے گئے تو نہر کے ٹھنڈے بخارات نے ان دانش مندوں کے ہوش اُڑا دیئے۔ ارے تمہیں کیا ہوگیا تم تو ہمارے تھے۔ اور تمہاری چال ڈھال بھی تبدیل ہوگئی۔ فطرت کا فیصلہ تھا یہ ہونا تھا۔

کیوں نہ ہوتا ایسا سب کچھ! یہ سینہ اطہر سے نکلا ہوا توحید باری تعالیٰ کا فیض تھا؟ جو کہ کافی، وافی، شافی تھا آنے والے تمام اوقات کیلئے۔ یہ تھی وہ نہر جو سینہ نبوت سے جاری ہوئی، یہ تھی وہ لطافت، بے کیفی، مستی قلب نبوت سے جاری ہوئی۔

صحابہؓ نے خوب جام نوش کئے، بہتے رہے آگے بڑھتے رہے، عجب بلانوش تھے صرف بلانوش ہی نہیں تھے، بلکہ لٹانا بھی خوب جانتے تھے۔ دوسروں کو پلاتے بھی تھے۔ ایسا کیوں نہ ہوتا توحیدی جام تھے اور ساقی توحید نے دیوانہ وار پلائے تھے۔ کوئی کمی نہ چھوڑی تھی۔

میکدے ان کی نگاہوں میں بسے رہتے ہیں
وہ جسے دیکھ لیں مستانہ بنا دیتے ہیں

ہاں جی ہاں جو بھی صحبت میں آیا ایسی توحیدی نظر ڈالی کہ عرفان باری تعالیٰ کی معراج پر فائز کر دیا۔ اِس لئے علماء اُمت کا اس بات پر اجماع ہے کہ سیدنا کریم ﷺ کی صحبت میں جس نے چند لمحات حالتِ ایمان میں گزار لئے۔ ساری کائنات کے اولیاء اللہ اُن کی ہمسری نہیں کر سکتے۔

کیوں نہ ہوتا ایسا! کیونکہ سیدنا کریم ﷺ توحید باری تعالیٰ، عرفان باری تعالیٰ، دیدار باری تعالیٰ رویت باری تعالیٰ، معیت باری تعالیٰ، قرب باری تعالیٰ کی جس بلندی پر مقیم تھے وہاں تک کسی کی رسائی نہ تھی۔ ایسے محبوب کی صحبت ایسے حامل توحید کی صحبت، ایسے صاحب عرفان کی صحبت سے فیض اُٹھانے والی ہستیوں کی ہمسری کرنا، برابری کرنا غیر صحابی کیلئے ممکن ہی نہیں۔

زمانہ اپنی چال چلتا رہا، صحابہؓ ''عہد وفا کر چکے تھے'' اُن کی دیوانگی کے سامنے کھڑے ہونا زمانے کے بس کا کام نہ تھا، تمام سزائیں اور رکاوٹیں بے اثر ہو چکی تھیں، مہک اُٹھ چکی تھی، بلکہ پھیل چکی تھی اور دلوں کو اسیر کر چکی تھی۔ بقول شاعر

ہم نے دل دے بھی دیا عہد وفا لے بھی لیا
آپ اب شوق سے دیں لیں جو سزا دیتے ہیں

حضورﷺ کے صحابہؓ اعلیٰ درجہ کی نسبت مع اللہ کے حامل تھے۔ بلکہ یوں کہنا بے جا نہ ہوگا کہ واصل حق ہو چکے تھے۔ بلکہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ نسبتِ توحید یہ کے انتہائی مقام کو چھو چکے تھے۔ وصل حق کیلئے فقط ایک نگاہِ نبوت کافی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ کیفیات کی بھول بھلیوں میں گم نہ ہوئے۔ سیدنا کریمﷺ کی اِک نظر نے منازل سلوک کے تمام معارف وحالات درجہ تکمیل تک پہنچا دیئے۔ جب تکمیل ہو چکی تو آہ وبکا کیسی۔ مقام اطمینان جو حاصل ہو چکا تھا۔ اس لئے حضرت علی کرم وجہہ نے فرمایا تھا کہ اگر مجھے جنت ودوزخ دکھا بھی دیا جائے تو میرے ایمان میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یہ بات کب کہی جاتی ہے جب حقیقت کھل چکی ہو تب ہی زبان سے ایسے الفاظ نکلا کرتے ہیں۔

اب ذرا آگے چلئے نسبت مع اللہ نے قیامت تک کیلئے جاری ہونا تھا۔ سیدنا کریمﷺ کی زبان اطہر سے کلمات جاری ہو رہے ہیں اور قلب اطہر سے کیفیات وواردات۔ تو بات یوں ہوئی کہ جسم نبوت اِک ہی وقت میں دوطرح کے حالات کا حامل تھا۔ اِک الفاظ ومعانی اور دوسرا کیفیات وواردات۔ اِس لئے تو سیدنا کریمؐ جب اذان کی آواز سنتے تو ہر اک کو بھول جاتے۔ اماں عائشہؓ فرماتی ہیں کہ حضورِ اقدسؐ ہم سے محو گفتگو ہوتے جیسے ہی اذان کے الفاظ کان میں پڑتے سب سے غفلت ہوگئی۔ اگر ہم نے ضرورت کے تحت کوئی بات کرنا چاہی تو پوچھا کہ کون ہو کہا کہ میں عائشہؓ تو حضور سیدنا کریمؐ فرماتے کہ کون عائشہ۔ یہ تھی الفاظ کی کیفیات جو حضور اقدسؐ سے صحابہؓ میں منتقل ہوئیں۔ پھر صحابہؓ سے اسکا انتقال اولیاء اللہ میں ہوا۔

اولیاء اللہ نے بھی اِس بحر وحدت سے خوب جام نوش فرمائے۔ اب سلوک صرف نظر کی بات نہ رہا۔ نسبت مع اللہ کا حصول اسقدر آسان نہ رہا۔ لیکن اسے تو آگے چلنا تھا۔ اللہ رب العزت نے اولیاء اللہ پر ریاضت ومجاہدے کے دروازے کھول دیئے۔ یوں بھی لکھا ہے کتابوں میں اس نسبت مع اللہ کو حاصل کرنے کیلئے کئی بزرگ ہستیوں نے کھانا اِسقدر کم کر دیا کہ کھاٹ کی روٹی بنا لی جب نفس نے کچھ زیادہ کھانے کا تقاضا کیا تو اس روٹی کو چبایا اور چوس لیا نفس کو یہ دلاسا دیا کہ تو نے روٹی کھالی۔ یہ کیوں کیا۔ جواب یہ ہے کہ وجود لطافت کو قبول کرنے والا بن جائے۔

خدا کو پیار آ گیا ایسے مجاہدات پر انتھک محنت رائیگاں نہ گئی۔ نسبت مع اللہ نے اپنا اثر ڈالنا شروع کیا۔ ذوق وشوق بڑھا۔ مستی عشق نے مدہوش کر دیا۔ کبھی ہوش، کبھی جوش، کبھی رنگ، کبھی بے رنگی، کبھی قرب، کبھی بعد، کبھی بسط، کبھی قبض جب ایسے حالات پیش آئے تو ان حضرات نے وفورِ جوش اور بے خودی میں ایسے کلمات کہے جن کو سمجھنا ذرا مشکل کام تھا۔ یہ کوئی ایسی بھی بری بات نہ تھی کیونکہ ہر کام کے دو پہلو ہوا کرتے ہیں ایک مثبت اور دوسرا منفی۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ کسی کام کو اچھے طریقے سے تب ہی مکمل کیا جا سکتا ہے جب دونوں پہلوؤں پر نظر ہو۔ اسی طرح ان حضرات کی بے خودی میں کہے ہوئے کلمات اُمت کیلئے انتشار نہیں بلکہ رحمت کا ذریعہ بنے۔ جی ہاں بات ذرا منفرد انداز میں کر دی گئی۔ ان حضرات نے جب انا الحق کا نعرہ بلند کیا تو بے خودی تھی، یا کسی فقیر نے یوں کیا کہ "میری شان بلند ہے" تو یہ مستی میں کہے گئے کلمات تھے۔ اِس لئے جب ہوش ہوا، نسیان کی کیفیات ختم ہوئیں تو کسی نے کہا کہ قبلہ آپ نے یہ باتیں کہیں اُنھوں نے فوراً رجوع فرمایا یہ نہیں کہا کہ ہم نے درست کہا بلکہ یوں کہا کہ اگر یہ کلمات ہم سے دوبارہ ادا ہوں تو ہم پر حد جاری کی جائے۔ یہ تھا اخلاص یہ تھی حقیقت کہ جناب خدا خدا ہے بندہ بندہ ہے۔ راہ کے راہی کو بہت سی اُونچی نیچی گھاٹیوں سے واسطہ پڑتا ہے۔ لیکن منزل تو آگے ہوا کرتی ہے۔ لیکن لوگوں کیلئے یہ الفاظ بجلی کی کڑک تھی۔ احباب چونک اُٹھے۔ بڑوں نے ان سے ذاتی فائدہ اُٹھایا اور اپنا کاروبار چمکایا۔ خیر اللہ رب العزت کو منظور کچھ اور تھا۔

پرانے مذاہب حادثات زمانہ کا شکار ہوئے۔ وقت گذرنے کے ساتھ ساتھ ان کے نقوش بدل گئے۔ مگر یہ تو توحیدی فیض تھا جو کہ قلب نبوت سے نکلا تھا۔ یہ نسبت مع اللہ تھی جسے قیامت تک چلنا تھا۔ آخر اس تطہیر کیلئے بھی تو کچھ ہونا چاہیے تھا۔

اصل نقل کا فیصلہ تو وہ کرتا ہے جسے معاملے سے کوئی تعلق ہو، جو حقیقت کو پا چکا ہو، جسکا سفر مکمل ہو چکا ہو۔ فطرت کا انداز بھی بڑا منفرد ہوا کرتا ہے۔ یہ کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔

معاملہ ابھی ٹھنڈا نہیں پڑا صوفیاء عشق و مستی کی منازل ابھی طے کر رہے ہیں ایک شیخ وقت نے عجب بات کہہ دی جی ہاں ہر چیز خدا ہے، ہر چیز خود کچھ نہیں بلکہ وہی ہے اشیاء کی خود کوئی

حقیقت نہیں۔

زمینوں میں تو آسمانوں میں تو اے خدایا

یہ صوفی باصفا تھے ابن عربی جنہوں نے وحدت الوجود کا نعرہ لگایا۔ کہ ہر چیز میں ذات باری تعالیٰ ہی جلوہ گر ہے۔

شاید اسی بات نے دنیا داروں کو تقویت بخشی جبکہ اہل نظر جانتے تھے کہ یہ ابن عربی کی اک خاص کیفیت ہے۔ حقیقت نہیں یہ گفتگو عقیدہ حلول کی طرف راہنمائی کرتی ہے۔ جسے اسلام کفر بتاتا ہے اس لئے کوئی اچھی بات تو نہ تھی۔

بہت عرصہ لوگ ابن عربی کے دیوانے رہے۔ مزے لے لے کر ابن عربی کے عقیدہ کو بیان کرتے۔ لیکن جب اکبر بادشاہ نے دین الٰہی کا دعویٰ کیا تو اس نے بھی کچھ یوں ہی کہا کہ ہر چیز میں وہ ہی جلوہ گر ہے اور مسجد و مندر کا فرق کچھ نہیں۔ یہ تھا وہ نازک مقام جس پر ابن عربی جیسے بلند پایہ ولی اللہ بھی لغزش کا شکار ہوئے۔ اسی نازک موڑ نے نئی کروٹ لی کیفیت نے اک نیا روپ دھارا۔ صوفی وقت کی معمولی سی غلط فہمی سے دنیا دار لوگوں نے اپنی دُنیا میں رنگ بھر لیا۔ حالانکہ راہ سلوک کی گھاٹیاں تھیں۔ راہِ سلوک کے راز تھے جن سے غیر سالک کو کوئی علاقہ نہ تھا اس لئے انجان نے جب اس کو جاننے کی کوشش کی تو بجائے حق شناسی کے وہ گمراہی کی طرف رُخ کر گئے۔

اللہ رب العزت کی ذاتِ اقدس نے راہِ ہدایت کو روشن تر کرنے اور سلوک کی تجدید کیلئے بروقت مقدس لوگوں کا انتخاب کیا۔ جن میں سے ایک صاحب عرفان ہستی شیخ احمد سرہندی مجددِ وقت کی تھی جن کو مجدد الف ثانی بھی کہا جاتا ہے۔ حضرت نے عقیدہ وحدت الوجود کی نفی ایسے انداز میں کی کہ عقل حیران رہ گئی صاحب سلوک حیرت زدہ ہو گئے کہ ہم کیا سمجھے تھے اور بات کیا نکلی۔ حضرتؒ نے فرمایا کہ حق یہ ہے کہ ہر چیز میں خدا نہیں بلکہ ہر چیز خدا کی وجہ سے ہے جسے وحدت الشہود کہا گیا۔ بس پھر کیا تھا اک طوفان اُٹھا، شور برپا ہوا، اک موج اٹھی سب غلط، سب کج روی، سب وہم و خیال کو بہا کر لے گئی۔ عقیدہ حلول کی مکمل نفی کی گئی۔

یہ حضرت کا وہ تجریدی کارنامہ تھا جو آج بھی تاریخ کا حصہ ہے اور حضرات صوفیاء کرام

کیلئے باعث فخر اور سر کا تاج ہے۔ اِس لئے صوفیاء حضرت مجدد صاحب کے ساتھ اپنی نسبت کرنا فخر سمجھتے ہیں۔

وقت دھیرے دھیرے گذر رہا ہے۔ راہِ تصوف بہت باریک ہوتا جا رہا ہے، صاحب عرفان کم یاب ہی نہیں بلکہ نایاب ہوتے جا رہے ہیں۔ مے خانوں کے نام ہی باقی رہ گئے ہیں۔ حالات عجب عجب تماشوں کا شکار ہیں۔ لوگوں کی سوچ جمود کا شکار ہو چکی ہے۔ بس جو دیکھ لیا اس کو خدا بنا لیا انسان بھی عجب الفطرت واقع ہوا ہے، حضرت سیدنا کریم ﷺ نے ان کی جان چھڑانا چاہی کہ تھک جاؤ گے، مایوس ہو جاؤ گے اور ذلیل ہو جاؤ گے چھوڑ دو سب کو، سب کے ایک خدا کی بات مان لو۔ لوگوں نے یہ سوچا ہر بار سوچا بلکہ بار بار سوچا کہ اب تو راہِ ہدایت شاید بند ہو چکی اب کوئی بھی ایسا نہ ہوگا۔ اللہ رب العزت نے ہر بار لوگوں کی اس ناقص سوچ کو توڑا ہر دفعہ اک نئے رنگ سے، ایک نئے شوق و ولولہ سے اک نئے انداز سے اک نئی ہستی کو عدم سے شہود میں لا کر لوگوں کے جمود کو تحریک میں بدل دیا۔

لوگ تو خواجہ بایزیدؒ کے دیوانے تھے، ابھی حضرت خواجہ کی مستی میں مست تھے کہ حضرت نے زندگی کو خدا حافظ کہہ دیا، بس چہرے بے رونق ہو گئے۔ خانقاہیں ویراں ہو گئیں، زندگی بے معنی سے محسوس ہونے لگی۔ راہِ تصوف مٹی مٹی سی نظر آنے لگیں۔ لیکن خدا تو خدا ہے وہ تو زندگی کو ہر لمحہ نئے نئے انداز عطا کر رہا ہے۔ کیا انسانیت خواجہ بایزید تک ہی محدود ہے کہ لوگ اسی نشے میں مست ہیں۔ نسل انسانیت بڑھ رہی ہے تو پھر جمود کیوں۔ شاید اسی لئے اقبال قلندرانہ انداز سے پکار اُٹھے۔

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

(جاری ہے)

(تلاش حق)

امام غزالیؒ

(مرسلہ رحمت اللہ شاہ بخاری)

امام غزالیؒ نے حق کی تلاش میں ایک طویل سفر طے کیا۔ اُنہوں نے علم کلام، علم فلسفہ اور اہل باطن کا لٹریچر پڑھا۔ اِن علوم سے انہیں اطمینان نہ ہوا۔ آخر وہ صوفیہ کی طرف متوجہ ہوئے اور مشقت سے بھرپور علمی کاوش کے بعد اپنی منزل کو پالیا۔ تلاش حق کی اس داستان کو اُنہوں نے اپنی مشہور زمانہ کتاب ''المنقذ'' میں قلمبند کیا۔

امام غزالی اپنی اس تصنیف میں علم کلام، علم فلسفہ اور اہل باطنیہ کے علوم کو ناقص محض ثابت کر کے طریق صوفیہ کو جن الفاظ میں بیان کیا ان کا ترجمہ خالد حسن قادری نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

جب میں ان علوم سے فراغت پا چکا تو صوفیائے کرام کے طریق کی طرف متوجہ ہوا اور میں نے جانا کہ ان کا طریق علم اور عمل دونوں سے پورا ہوتا ہے۔ ان کے عمل کا نتیجہ اور حاصل یہ ہے کہ نفس کی دشواریاں قطع ہو جاتی ہیں اور وہ اخلاق ذمیمہ اور صفات خبیثہ سے پاک وصاف ہو جاتا ہے اور قلب غیر اللہ سے خالی ہو کر ذکر الٰہی سے روشن ہو جاتا ہے اور چونکہ میرے لئے اِس علم کا حصول عمل سے آسان تر تھا اِس لئے میں نے ان کتابوں کے مطالعہ سے ان کے علم کی تحصیل شروع کی۔ مثلاً (حضرت) ابوطالب مکی رحمتہ اللہ علیہ کی قوت القلوب اور الحارث المحاسبی کی کتابیں، حضرت جنید کے متعلق متفرق واقعات، حضرت شبلی، بایزید بسطامی قدس اللہ اروا حھم اور انہیں کی طرح دیگر مشائخ کی کتابوں کا مطالعہ کیا۔

یہاں تک کہ ان کے علمی مقاصد کی ماہیت وحقیقت کو پالیا اور جو کچھ بھی تعلیم (مطالعہ) اور سماع (گفتگو ومکالمہ) سے حاصل ہو سکتا تھا وہ حاصل کر لیا۔ لیکن مجھ پر ظاہر ہو گیا کہ ان کے اصل خواص مطالعہ سے حاصل نہیں ہو سکتے بلکہ ذوق حال اور اپنی صفات کو تبدیل کرنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

اور کتنا فرق ہے صحت اور شکم سیر کی تعریف اور اس کے اسباب وشرائط کا علم حاصل کرنے میں اور صحت منداور شکم سیر ہونے میں!

اور کتنا فرق ہے نشہ کی تعریف سیکھ لینے میں کہ وہ ایک ایسی حالت سے پیدا ہوتا ہے جس میں بخارات معدہ سے اُٹھ کر دماغ کو چڑھتے ہیں اور اِس شخص میں کہ نشے سے چور ہے! بلکہ نشہ میں چور آدمی نشہ کی تعریف کو سمجھتا ہی نہیں نہ نشہ کے مالہ وماعلیہ سے واقف ہے، نہ اس کے متعلق اور کسی شے کا علم رکھتا ہے، اِس کے برعکس ہوشمند (نشہ باز کی ضد) آدمی نشہ کو سمجھتا ہے اس کے اسباب کا علم رکھتا ہے لیکن کسی قسم کا نشہ (اس سے اسے) حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح طبیب جب خود بیمار ہو تو باوجودیکہ وہ صحت کی تعریف سے واقف ہے اور ادویات کو بھی بخوبی جانتا ہے لیکن اِس سے اِسے صحت حاصل نہیں ہوتی۔

اِسی طرح فرق ہے زاہد کی حقیقت، اس کی شرائط اور اسباب کا علم ہونے اور زاہدانہ زندگی بسر کرنے اور نفس کو دنیا سے کنارہ کش کرنے میں۔ اور میں نے بالیقین یہ معلوم کر لیا کہ صوفیائے کرام ارباب حال ہیں اصحاب قال نہیں اور جہاں تک جو کچھ باقی رہ گیا تھا اِسے تعلیم (مطالعہ) اور سماع (گفتگو و مکالمہ) سے حاصل کرنا ممکن نہیں سوائے ذوق اور سلوک کے۔

اور علوم شرعیہ اور علوم عقلیہ کی تحقیق و تفتیش کے سلسلے میں جن علوم میں مجھ کو مشق و مزاولت تھی اور جن راستوں پر چل چکا تھا، اِن سے مجھے (یہ تین امور) یقینی طور پر حاصل ہو چکے تھے:۔

۱۔ اللہ تعالیٰ پر ایمان یقینی۔

۲۔ نبوت پر ایمان یقینی۔

۳۔ اور روز آخرت پر ایمان یقینی۔

اور ایمان کے یہ اصول ثلاثہ میرے دل میں کسی دلیل معین سے نہیں بلکہ ان اسباب وقرائن اور تجربات سے نہایت مستحکم طور پر جم چکے تھے جو تفاصیل کے متحمل نہیں۔

اور مجھ پر یہ امر بھی روشن ہو گیا کہ سعادت اُخروی کی توقع سوائے تقویٰ کے اور نفس کو ہوا و ہوس سے بچانے کے نہیں کرنی چاہیے اور ان سب کی اصل علاقہ دل کو دنیا سے قطع کرنا اور اس دار غرور سے منہ پھیر کر دار الخلود کی طرف رجوع کرنا اور نہایت ہمت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہونا ہے اور یہ باتیں مال و جاہ سے روگردانی کرنے اور مشاغل (دنیوی و) علائق سے کنارہ کشی کرنے کے سوا حاصل نہیں ہوتیں۔

پھر میں نے اپنے احوال پر غور کیا تو دیکھا کہ میں علائق دنیوی میں گرفتار ہوں جو مجھے چاروں

طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ پھر میں نے اپنے اعمال کی طرف نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا کہ ان میں سب سے اچھا کام تدریس و تعلیم کا ہے لیکن اس میں بھی بہت سے غیر ضروری علوم داخل ہیں جو طریق آخرت میں کچھ مفید نہیں۔ پھر میں نے تدریس میں نیت پر غور کیا کہ کیسی ہے؟ تو ثابت ہوا کہ وہ بھی خالصتاً لوجہ اللہ نہیں بلکہ اس کا محرک اور باعث جاہ کی طلب اور شہرت کی آرزو ہے اور مجھے یقین ہو گیا کہ میں گویا بہہ جانے والے ریتلے ساحل پر کھڑا ہوں اور اگر اپنے حال کی تلافی نہ کی تو (دوزخ کی) آگ میں گر جاؤں گا۔

میں مدت تک اسی فکر میں غلطاں و پیچاں رہا۔ زمام اختیار میرے ہی ہاتھ میں تھی (مگر فیصلہ نہ کر پاتا تھا) کبھی تو میں بغداد سے چلے جانے کا اور (دنیوی وجاہت کے) احوال کو ترک کر دینے کا ارادہ کرتا اور کبھی اس سارے عزم ہی سے ہاتھ اٹھا بیٹھتا۔ ایک قدم آگے بڑھاتا تھا تو دوسرا پیچھے ہٹاتا تھا۔ اگر صبح کو حصول عقبٰی کی طلب صادق پیدا ہوتی تھی تو اسی شام کو خواہشات نفسانی کا لشکر حملہ آور ہو کر اسے مغلوب کر دیتا۔

شہوات دنیوی اپنی زنجیروں میں جکڑ کر مجھے اسی مقام پر رہنے پر مجبور کرتی تھیں اور دوسری طرف ایمان کا منادی کرنے والا آواز دیتا تھا۔ ''کوچ! کوچ'' عمر بہت تھوڑی رہ گئی ہے اور سفر طویل درپیش ہے اور جو کچھ علم و عمل تیرے گرد و پیش پھیلا ہوا ہے وہ بجز ریا و تو ہم کے اور کچھ نہیں۔ اگر تم آخرت کیلئے اب تیار نہ ہوئے تو پھر کب ہو گے اور اگر اب ترک علائق نہ کیا تو پھر کب کرو گے؟

ان سب باتوں سے ارادہ میں قوت پیدا ہوئی اور فرار ہونے کا عزم بالجزم پیدا ہوا۔

شیطان پھر آ کر بہکاتا اور کہتا۔ ''یہ تو عارضی کیفیت ہے۔ اس کی پیروی مت کرو۔ یہ سریع الزوال ہے۔ اگر اس (خیال موہوم) کی پیروی کر کے اس جاہ و منصب اور شان و شوکت جو آج تمہیں بلا خدشہ او بلا کدورت حاصل ہے، اور دشمنوں کی ریشہ دوانیوں سے بھی محفوظ ہے، چھوڑ دو گے، تو شاید تمہارا نفس پھر اس کی طرف مائل ہو۔ پھر یہ اعزاز تمہیں آسانی سے حاصل نہ ہو سکے گا۔

اوائل رجب ۴۸۸ ہجری سے تقریباً چھ مہینے تک میں شہوات دنیوی اور دواعی آخرت کے درمیان کشاکش و تردد میں مبتلا رہا اور آخر اسی ماہ میں معاملہ میرے حد اختیار سے نکل کر اضطرار و مجبوری تک پہنچ گیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے میری زبان بند کر دی اور پھر میں پڑھا نہ سکا۔ اگر میں کسی دن کوشش بھی کرتا کہ طلبہ کا دل خوش کرنے کے لیے انہیں کچھ پڑھاؤں تو زبان سے ایک

کامہ بھی نہیں نکلتا تھا اور میں کچھ بھی نہیں کر پاتا تھا۔ زبان کی اس بندش سے دل کو نہایت رنج وقلق ہوا میری قوت ہاضمہ جاتی رہی اور کھانا پینا ہضم ہونے سے رہ گیا۔ حتیٰ کہ نہ تو ثرید میرے حلق سے نیچے اُترتی تھی اور نہ ہی ایک لقمہ ہضم ہوتا تھا اور سخت ضعف غالب ہو گیا۔ یہاں تک کہ تمام اطباء علاج سے مایوس ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ ''پہلے اس کے قلب کو کوئی صدمہ پہنچا ہے پھر اس نے مزاج کی طرف سرایت کی اور اب اس کا علاج بغیر اس کے ممکن نہیں کہ (دل کو) اس صدمہ واندوہ سے راحت ہو۔

پھر جب میں نے محسوس کر لیا اور میں عاجز محض ہو گیا اور کوئی اختیار باقی نہیں رہا، تو میں نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں اس طرح التجا کی جیسے کوئی بے وسیلہ و بے سہارا التجا کیا کرتا ہے۔ پس اس مجیب الدعوات نے میری التجا قبول فرمائی جو بیقراروں کے التجا کرنے پر ان کی درخواست قبول فرماتا ہے اور اس نے میرے قلب پر جاہ و مال اور اولاد واصحاب سے روگردانی آسان کر دی۔

اور میں نے ظاہر کیا کہ میں مکہ کو جانا چاہتا ہوں۔ لیکن میں نے اپنے آپ کو شام کے سفر کیلئے تیار کیا۔ یہ احتیاط اس خیال سے تھی کہ کہیں خلیفہ اور جملہ اصحاب میرے قیام شام کے ارادہ سے باخبر نہ ہو جائیں۔

پھر میں نے بغداد سے نکلنے کا بہ لطائف الحیل اس طرح ارادہ ظاہر کیا کہ پھر کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔ اس پر عراق کے علماء وائمہ نے مجھے تیر ملامت کا نشانہ بنایا۔ کیونکہ ان میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو ان مناصب کے ترک واعراض کو جو مجھے حاصل تھے، امر دینی سمجھتا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ دین کا سب سے اعلیٰ منصب اور مرتبہ یہی ہے (جو مجھے حاصل ہے) اور یہ حال تھا ان کے مبلغ علم کا!۔

پھر عوام الناس میں (میرے طرزِ عمل سے) استنباط میں (طرح طرح کی) پریشان خیالیاں ظاہر ہوئیں۔ وہ لوگ جو عراق سے دور تھے، اُنہوں نے میرے اس عمل کو حکومت کے خوف پر محمول کیا اور جو ارباب حکومت سے قریب تھے وہ مشاہدہ کر رہے تھے کہ کس طرح ارباب حکومت میرے ساتھ تعلقات کی استواری کیلئے بصد الحاح واصرار کوشاں ہیں اور میں کس طرح ان سے دامن کشاں ہوں۔ مجھے ان سے بے تعلقی اور ان کے قول (فعل) سے بے التفاتی ہے۔ پھر وہ لوگ کہتے کہ یہ امر آسمانی ہے اور اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اہل اسلام اور علمائے اسلام کو نظر بد لگ گئی ہے۔

پھر میں نے بغداد چھوڑ دیا اور جو کچھ مال میرے پاس تھا وہ میں نے دے ڈالا صرف اس قدر رکھ لیا جو کفالت اطفال کیلئے کافی ہو۔ (جو دے ڈالا وہ) اس لئے کہ عراق کا مال مصالح قومی

کے لیے مختص اور مسلمانوں کے لیے وقف ہے اور سارے عالم میں ایسا انتظام نہیں دیکھنے میں آیا (جو مال رکھ لیا وہ اس لیے کہ) عالم اپنے عیال کے لیے جو کچھ اس (مال) میں سے رکھ لے وہ سب سے زیادہ صالح (مال) ہے۔

اس کے بعد میں ملک شام چلا گیا اور وہاں تقریباً دو سال رہا اور اس عرصے میں سوائے گوشہ نشینی وخلوت گزینی، ریاضت ومجاہدہ اور ذکر الٰہی سے تزکیہ نفس اور تہذیب اخلاق کے میرا اور کوئی مشغلہ نہ تھا۔ جس طرح میں نے اسے علم تصوف سے سیکھا تھا۔ دمشق کی مسجد میں ایک عرصہ تک معتکف رہا۔ مسجد کے مینارہ پر سارے دن کے لیے چڑھ کر دروازہ بند کر لیتا تھا۔

اس کے بعد میں دمشق سے بیت المقدس گیا اور وہاں الصخرہ میں جا کر اس کا دروازہ بند کر کے بیٹھ جاتا تھا۔ پھر مجھے فریضہ حج کی ادائیگی کی تحریک ہوئی اور مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے فیوض وبرکات سے مستفید ہونے کی خواہش پیدا ہوئی اور خیال پیدا ہوا کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ صلوٰۃ اللہ علیہ کی زیارت سے فارغ ہو کر حضرت رسول کریم ﷺ کی زیارت (پر افاضت) سے مشرف ہوں۔ پھر میں نے حجاز کا سفر کیا۔ اس کے بعد بعض امور اور بال بچوں کے اصرار نے مجھے پھر وطن کی طرف کھینچا اور میں واپس لوٹا اگرچہ میں خلقت کی طرف رجوع کرنے کے لائق نہیں رہا تھا۔

وہاں بھی عزلت گزیں، خلوت پسند اور ذکر الٰہی سے تزکیہ قلب میں مشغول رہا۔ آخر زمانے کے حوادث، عیال واطفال کی ضروریات اور وجہ معاش کی تنگی، اصل مقصد مراد میں خلل انداز ہوتی تھی اور صفائے خلوت کو مکدر کرتی تھی اور صفائی وجمعیت احوال صرف اوقات متفرقہ ہی میں حاصل ہوتی۔ اس کے باوجود میں صفائی قلب وجمعیت خاطر سے مایوس نہ ہوا اور اگرچہ علائق دنیویہ مجھے اس سے روکتے تھے لیکن بار بار اس کی طرف رجوع کرتا۔ اسی حالت میں دس برس کے قریب گزر گئے۔ ان خلوتوں اور عزلتوں میں بہت سے امور واسرار منکشف ہوئے جن کا احاطہ و شمار ناممکن ہے۔ ان میں سے صرف اسی قدر بیان کرتا ہوں جس سے فائدہ پہنچے۔ اس عرصہ میں مجھے یقیناً معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ کے راستہ پر چلنے والے صرف صوفیائے کرام ہیں اور انہیں کی سیرت سب سے اعلیٰ، انہیں کا طریقہ سب سے درست اور انہیں کے اخلاق سب سے پاکیزہ ہیں بلکہ اگر کل عقلاء کی عقلیں اور سب حکماء کی حکمتیں اور تمام علمائے شریعت اور واقفان علوم دینیہ کے علوم جمع کیے جائیں کہ صوفیائے کرام کے سیرت واخلاق میں کوئی تغیر یا اس سے بہتر کوئی تبدیلی کی جا سکے۔ تو ایسا کرنے کوئی سبیل نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ صوفیائے کرام کے تمام حرکات وسکنات خواہ ظاہری ہوں یا باطنی، مشکاۃ نبوت کے نور سے مقتبس ہیں اور روئے زمین پر کوئی نور

سوائے نور نبوت کے ایسا نہیں جس سے اکتساب نور کیا جائے اور حاصل کلام یہ کہ کہنے والا ایسے طریقے کے متعلق کہہ ہی کیا سکتا ہے۔ طہارت جو اس کی شرط اول ہے ماسوی اللہ سے دل کا قطعی پاک و مطہر کرنا ہے اور اس کا پہلا مرحلہ بجائے نماز کی تکبیر تحریمہ کے دل کا کلیۃً ذکر الٰہی میں مستغرق ہو جانا ہے۔ اور اس کا آخری درجہ کلیۃً فنا فی اللہ!

اور فنا کا یہ آخری درجہ (جو ہم نے طریق تصوف کا بیان کیا) در حقیقت اخیر درجہ نہیں اس کا آخری ہونا صرف اس لحاظ سے ہے کہ جہاں تک کسب و اختیار کا تعلق ہے یہ اس کا آخری درجہ ہے ورنہ در حقیقت یہ اول درجہ سلوک کا ہے اور اس سے پیشتر جو کچھ تھا وہ سالک کے لیے مثل دہلیز کے تھا۔ (یہ وہ طریقہ ہے) جس کے پہلے ہی مرحلہ سے مشاہدات و مکاشفات شروع ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ وہ عالم بیداری میں فرشتوں کو اور انبیاء کی ارواح کو دیکھتے ہیں اور ان کی آوازوں کو سنتے ہیں اور ان سے فوائد حاصل کرتے ہیں۔

پھر صور و امثال کے اس مقام سے بھی ترقی ہوتی ہے اور ایسے درجات پر فائز ہوتے ہیں کہ ان کے حال کے بیان سے قوت ناطقہ عاجز آ جاتی ہے اور کوئی اس کی تعبیر ایسے الفاظ میں نہیں کر سکتا کہ جو صریح خطا پر مشتمل نہ ہو۔

آخر کار مقام قرب الٰہی کے اس درجہ کو پہنچ جاتے ہیں کہ بعض لوگ اسے حلول خیال کرنے لگتے ہیں۔ بعض اسے اتحاد سے تعبیر کرتے ہیں اور بعض اسے وصول کا نام دیتے ہیں۔ مگر یہ سب تعبیرات غلط ہیں ان کے غلط ہونے کی وجہ ہم نے کتاب المقصد الاسنیٰ میں بیان کر دی ہے۔ لیکن ہاں جس نے اس حقیقت کو پا لیا ہے وہ اس کے سوا اور کیا کہہ سکتا ہے۔

''جو کچھ تھا بس تھا۔ کیا اس کا ذکر کروں۔ یہ سمجھو کہ کوئی بہت اچھی خبر ہے۔ کیا پوچھتے ہو کہ کیا ہے؟''

غرض جس شخص کو تصوف کا ذوق نہیں دیا گیا اس کو حقیقت نبوت سوائے اس کے کہ یہ ایک نام (یا لفظ ہے) اور کچھ نہیں معلوم اور اولیاء اللہ کی کرامات فی الحقیقت انبیاء کی بدایات (آغاز و ابتدا) ہیں اور یہ حالت آنحضرت ﷺ کو ان دنوں حاصل تھی جب آپ ﷺ دنیا سے قطع تعلق کر کے غار حرا میں تشریف لے گئے تھے اور وہاں خلوت میں اپنے رب کی عبادت میں مشغول تھے حتیٰ کہ عرب کے لوگ یہ کہتے تھے کہ:

''حضرت محمد ﷺ اپنے رب پر عاشق ہو گئے ہیں''۔

یہ وہ حالت ہے۔ جس کو اہل ذوق جو سلوک کے راستہ پر چلتے ہیں بخوبی جانتے ہیں۔

اور جنہیں یہ ذوق مقدر نہیں کیا گیا وہ تجربے سے اور محض سن کر بھی اسے سمجھ سکتا ہے بشرطیکہ ایسے لوگوں کی معیت اور ہم نشینی بکثرت اختیار کرے۔

قرائن احوال سے بھی یہ کیفیت یقیناً سمجھ میں آ سکتی ہے جو شخص بھی اولیاء اللہ کی صحبت اختیار کرے گا وہ ان سے ایمان حاصل کرے گا۔ یہی ایک گروہ ایسا ہے جن کا صحبت یافتہ کبھی شقی و محروم نہیں رہا۔

اور جسے اولیاء اللہ کی صحبت میسر نہ ہو وہ بھی دلیل و برہان سے یقیناً اس کا علم حاصل کر سکتا ہے جیسا کہ ہم نے اپنی کتاب عجائب القلب میں جو احیاء علوم الدین کی کتب میں شامل ہے، ذکر کر دیا ہے۔

اس کیفیت کو برہان و دلیل سے حاصل کرنا علم ہے اور اس حالت کی مشق و مزاولت ذوق ہے۔ سن کر تجربہ کر کے اور حسن ظن سے قبول کر لینا ایمان ہے۔ یہ تین درجے ہیں۔

''جو لوگ ایمان لائے ہیں تم میں سے اور جن لوگوں نے علم حاصل کیا ہے اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند کرتا ہے''۔

اور ان لوگوں کے سوا ایک قوم جہال ہے۔ جو اس اصل حالت سے بالکل منکر ہے۔ یہ لوگ ایسی باتوں کو سن کر متعجب ہوتے ہیں۔ سنتے ہیں اور مسخرہ پن کرتے ہیں اور کہتے ہیں:۔

''تعجب ہے! کیا فضول باتیں کرتے ہیں''۔

انہیں لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:۔

''بعض ان میں سے ایسے لوگ ہیں جو تمہاری باتیں سنتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب تمہارے پاس سے نکل کر جاتے ہیں تو ان لوگوں سے جو علم والے ہیں، کہتے ہیں کہ دیکھو اس نے آج کیا کہا؟ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر لگا دی ہے۔ وہ اپنی ہوا و ہوس کی پیروی کرتے ہیں، سو اللہ تعالیٰ نے انہیں بہرا اور اندھا بنا دیا ہے''۔

شکر گزار کیسے ہوا جائے؟

(رُخسار بشیر)

زندگی دُکھ سکھ کا سنگم ہے یہاں خوشیاں اور غم آنکھ مچولی کھیلتے ہی رہتے ہیں، کبھی مسائل اور پریشانیوں کی تپش زندگی کو جون کی تپتی ویران دوپہروں جیسا بنا دیتی ہے تو کبھی خوشی کی تتلی من آنگن پر جب اپنے حسین پر پھیلاتی ہے تو سارے موسم، سارے منظر، سارے رنگ دلکش، دلربا اور خوبصورت لگنے لگتے ہیں لیکن کیسی حیرت کی بات ہے۔ ہم تسلی کے دلکش رنگوں جیسے تمام خوشگوار لمحوں کو بھول جاتے ہیں۔ ہمیں خوشی کی تتلی مٹھی میں قید کرنے کا ہنر نہیں آتا ہمیں تو بس ایک ہی فن آتا ہے۔۔۔

اپنی افسردگی کو اشتہار بنا لینے کا فن، اپنے دکھوں کی پبلسٹی کرنے کا فن، اپنی محرومیوں پر شکوہ کناں رہنے کا سلیقہ، ہم اپنے ساتھ ایک چھوٹا سا تھیلا رکھتے ہیں جس میں ہم یاد سے احتیاط سے اپنے دکھوں، تکلیفوں، محرومیوں اور مسائل کو ایک ایک کر کے جمع کرتے رہتے ہیں اور پھر گا ہے گا ہے اِس تھیلے میں سے کسی محرومی، کسی دکھ یا تکلیف کو نکالتے ہیں جی بھر کر خود کو اور دوسروں کو آزردہ کرتے ہیں۔ ہم اپنے ذہن کے کمپیوٹر میں ایک فولڈر بنا لیتے ہیں اور اس کا نام رکھتے ہیں شکایات اور پھر لفظوں کی صورت زبان پر سجا لیتے ہیں اور کہتے ہیں ''آخر میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوتا ہے؟'' سب کو خوشیاں مل جاتی ہیں میرا حصہ کھو جاتا ہے۔'' میں نے ہمیشہ اس کا بھلا چاہا لیکن اس نے میرے ساتھ کیا کیا؟ ہماری زندگی میں اس قدر ناشکرا پن، گلہ شکوہ اور تقاضا کیوں ہے؟ کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا؟ سوچا؟ آیئے دیکھتے ہیں کہ اس ناشکر گزاری کے پس منظر میں کون سی وجوہات کارفرما ہوتی ہیں۔

معاشی ناآسودگی۔

قناعت پسندی کا نہ ہونا، توکل کی کمی۔

سادہ اور فطری انداز زندگی سے دوری۔

آپ دیکھ لیجئے۔ کہ دیہاتوں میں لوگ آپ کو زیادہ مطمئن نظر آئیں گے کم وسائل اور زیادہ مسائل کے باوجود ان کی زبان پر گلے شکوے کے الفاظ نسبتاً کم ہوں گے۔ آج کا انسان اپنے موجودہ اسٹیٹس سے مطمئن نہیں وہ اوپر سے اوپر جانے کی خواہش میں جائز، ناجائز ذرائع استعمال

کرتا ہے اور جب اس کوشش میں حسب خواہش کامیاب نہیں ہو پاتا تو ناشکری کرتا ہے۔ ہم دوسروں کیلئے جیسا بھی سوچیں لیکن لوگ ہمارے لئے گڑھا کھودیں تو ہم برداشت نہیں کر پاتے اور گلہ کرتے ہیں۔ منفی اندازِ فکر بھی زندگی کو گلے اور شکوے سے بھر دیتا ہے کسی محرومی کے چھوٹے سے دھبے کو پھیلا کر ساری زندگی کو سیاہ بنا لیتے ہیں۔ تلخ واقعات کو کیلنڈر کی صورت، تصویروں کی صورت دیوار پر چسپاں کر دیتے ہیں پھر چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے اس کیلنڈر اور تصویروں کو دیکھ کر آہیں بھرتے ہیں اور جلتے کڑھتے ہیں۔ زندگی میں ناشکرگزاری کی ایک بڑی وجہ بے جا خواہشات کی کثرت ہے۔ حضرت علیؑ کا قول ہے خواہشوں کو قلیل رکھو تو راحت پاؤ گے۔ بلکہ دیکھا جائے تو زندگی میں انتشار کا ایک بڑا سبب یہ خواہشات ہی ہیں۔ کہیں اعلیٰ مرتبے کی خواہش، اعلیٰ اور بلند معیارِ زندگی کی تمنا، کہیں جاہ و حشمت اور حکمرانی کی خواہش، لوئر کلاس کی مڈل اور مڈل کلاس کی اپر کلاس میں شامل ہونے کی خواہش۔ زندگی کے ہر میدان میں سب کچھ پا لینے، حاصل کر لینے کی آرزو۔ کہیں ضروریاتِ زندگی کی تمنا، تو کہیں سہولیات اور آسائشات تعیشات کی خواہش، دوسروں کو گرا کر آگے نکل جانے کی خواہش، اچھی ملازمت، بچوں کو اچھے سے اچھے سکول و کالج میں داخل کروانے کی خواہش غرض ہماری اکثر و بیشتر خواہشات دنیا اور حصولِ دنیا کے گرد گھومتی ہیں (باطن کی بجائے ظاہر کو بہتر بنانے کی ایک دوڑ لگی ہوتی ہے) اور جب یہ خواہش پوری نہیں ہوتیں تو ہم Frustrated ہو جاتے ہیں اور نتیجتاً شکوے شکایات اور گلے پر اُتر آتے ہیں ناشکری کرتے ہیں، قرآن پاک میں فرمایا گیا۔ ''انسان ہے ہی ناشکرا اور جلد باز''۔ سو ہمیں معلوم نہیں کہ Nait of see کیا ہوتا ہے ہم اپنی Input فوری Output چاہتے ہیں لیکن جب ہمیں انتظار کی کیفیت سے گزرنا پڑتا ہے تو ہم مایوسی اور بے صبری کا مظاہرہ کر کے شکایات کا دفتر کھول لیتے ہیں۔ کسی بھی واقعہ کا جو فوری نتیجہ ہمارے سامنے آتا ہے اس کی بنیاد پر ہم اپنی خوش قسمتی کا تعین کرتے ہیں جب نتیجہ ہماری حسبِ منشاء نہیں نکلتا تو ہمیں کہا جاتا ہے اس میں بہتری ہوگی۔ لیکن ہمیں اپنی جلد بازی اور کم فہمی کے باعث جب وہ بہتری کہیں نظر نہیں آتی تو ہم ناشکری پر اُتر آتے ہیں۔ ہمیں جب کامیابی ملتی ہے تو تب سارا کریڈٹ ہم خود لینا چاہتے ہیں اس کامیابی

کو اپنی محنتوں اور کاوشوں کا ثمر قرار دیتے ہیں اپنی صلاحیتوں پر فخر کرتے ہیں اور اکثر مغرور بھی ہو جاتے ہیں تب ہم کبھی نہیں کہتے میں ہی کیوں Why me لیکن کیسی حیرت کی بات ہے جب ناکامی ہمارے حصے میں آتی ہے جب کچھ دے کر ہم سے واپس لیا جا رہا ہوتا ہے تو ہم بوکھلا جاتے ہیں پریشان ہو جاتے ہیں، چلا اُٹھتے ہیں اور کہتے ہیں میں ہی کیوں؟ Why me

گلے، ناشکر گزار سے کیسے بچا جا سکتا ہے؟

واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں۔

تکلیف کو تکلیف سمجھ کر راضی رہنا، آدھا شکر ہے۔

پورا شکر یہ ہے کہ تکلیف کو تکلیف نہ سمجھیں۔

تسلیم و رضا کی خو اپنا لیں۔

کسی چیز کا شکر ادا کرنے کیلئے ضروری ہے کہ جو چیز آپ کو دی گئی ہے آپ کو اس کی اہمیت کا ادراک ہو، احساس ہو کیونکہ کسی نعمت کا ادراک اور پھر اعتراف ہی شکر گزاری ہے۔

خواہشات کو قلیل اور زندگی کو سادہ بنا لیں۔

قناعت پسندی اور توکل کی روش اپنا لیں۔

ناشکر گزاری سے بچنے کیلئے ضروری ہے کہ ہر روز صبح اٹھ کر ہم اپنے آپ سے کہیں ''اللہ تیرا شکر! کہ تو نے مجھے میری اوقات سے کہیں بڑھ کر نوازا ہے''۔ دنیا میں سب کچھ مل تو نہیں جاتا جو نہیں ملا اس کا ملال کرنے سے بہتر کیا یہ نہیں کہ ہمارے پاس جو موجود ہے اس کا شکر ادا کرنا سیکھ لیں وہ جو مل گیا اسے یاد رکھیں۔ جو نہیں ملا اسے بھول جائیں بہت کچھ نہ ہونے کے باوجود بھی ہمارے پاس بہت کچھ ابھی بھی ایسا ہے اتنی ڈھیر ساری نعمتیں ہیں ہاتھ پاؤں، آنکھیں سلامت ہیں حوصلہ قائم ہے بہت سی محبتیں اور شفقتیں ہمارے پاس ہیں جن سے دیگر بہت سے لوگ محروم ہونے کے باوجود شکر گزار رہتے ہیں۔ مثلاً ہیلن کیلر کا نام آپ نے سنا ہوگا جسے مارک ٹوئن نے اکیسویں صدی کی سب سے بڑی دلچسپ شخصیت قرار دیا تھا ہیلن کیلر نہ دیکھ سکتی تھی بول سکتی تھی، سن سکتی تھی محض لمس کو محسوس کر سکتی تھی لیکن اس کے اندر کچھ کر دکھانے کی طلب نے اسے اس مقام

پر لا کھڑا کیا کہ وہ اتنی محرومیوں کے باوجود نامور خاتون بن گئی۔ اپنی آٹو بائیوگرافی میں ہیلن کیلر نے ایک کمال کی بات لکھی کہ دیکھو میں بہت خوش ہوں کہ میرے خدا نے میرے اوپر بڑا اکرم کیا ہے اگر یہ ساری چیزیں، یہ ساری نعمتیں اندھے ہونا، بہرے ہونا، گونگے ہونا مجھے نہ ملی ہوتیں تو میں دنیا کی ایک نامور خاتون نہ ہوتی بلکہ ایک معمولی سی گھریلو عورت ہوتی۔

ایک معقولہ مشہور ہے ''جو لوگوں کا شکر گزار نہیں ہوتا وہ خدا کا شکر گزار کیسے ہو سکتا ہے''۔ اللہ کے بندوں کا شکر گزار ہونے کیلئے ضروری ہے کہ ہم ان کی بھلائیوں اور نیکیوں کو یاد رکھیں جو اُنھوں نے ہمارے ساتھ کیں۔ ایسے لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ دنیا میں بہت سی نامور اور عظیم شخصیات ایسی گزری ہیں جن کا تعلق انتہائی عام خاندانوں سے تھا جنہوں نے اپنی صلاحیتوں پر اعتماد اور اللہ پر انحصار ہے۔ اکثر یہ الفاظ دہراتے رہا کریں یا اللہ! مجھے اپنی رضا میں راضی کر لے، مجھے ویسا بننے کی توفیق دے جیسا تو اپنے بندوں کو دیکھنا چاہتا ہے'' یہ مشق تسلیم و رضا سیکھنے کیلئے بہترین ہے۔ ہمیں زندگی میں دو طرح کے لوگ نظر آتے ہیں ایک وہ لوگ ہیں جنہیں ذرا سی تکلیف پہنچتی ہے ذرا سا دکھ ملتا ہے تو گلہ بان کی زبان پر آ جاتا ہے اگر خزاں کا ایک پتہ بھی آ گرے تو یہ ناشکری کرتے ہیں پھولوں بھری زندگی میں ایک کانٹا بھی آ جائے تو گلہ کرتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہمیشہ برسنے والی رحمتوں کی عنایات کی عطاؤں کی بارش تو بھول جاتے ہیں لیکن یاد رکھتے ہیں تو لو کا وہ ایک تھپیڑا جس نے کبھی انہیں ہلکے سے چھوا تھا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو جوتا گم ہونے پر چلنا چھوڑ دیتے ہیں محرومی کے چھوٹے سے نقطے کو پھیلا کر زندگی کے ایام بدر کو بھی اماوس بنا لیتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کی نظریں شیشے پر چسپاں مری ہوئی مکھی پر جا کر ٹھہر جاتی ہیں لیکن شیشے کے اس پار تا حد نگاہ پھیلا حسن و جمال محسوس نہیں ہوتا۔ یہ وہی لوگ ہیں جو خوشیوں کی پوٹلی میں سے چھانٹ چھانٹ کر دُکھ نکالتے ہیں اور پھر انہیں تعویذ بنا کر گلے میں ڈال لیتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو زندگی کے ڈھیر سارے خوشگوار لمحوں میں سے کوئی ناخوشگوار لمحہ ڈھونڈ کر کیلنڈر کی صورت دیوار پر لٹکا لیتے ہیں اور پھر ہر وقت اسے یاد کر کے آہیں بھرتے ہیں تقدیر سے گلہ کرتے ہیں ناشکری کرتے ہیں۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جنہیں دھوپ میں کھڑا کیا جائے یا چھاؤں میں ان کے دل کا پیمانہ شکری گزاری اور احسان مندی کے جذبات سے لبالب رہتا ہے۔ جن کی خزاں زدہ زندگی میں بہار کا ایک معطر جھونکا بھی بہت معنی رکھتا ہے اور وہ اس جھونکے کو ساری زندگی یاد کر کے اپنی حبس زدہ زندگی کو مہکاتے رہتے ہیں۔ جو خوشی کا ایک لمحہ عطا ہونے پر بھی کہتے ہیں۔ اے اللہ! تو ہمیشہ سے مجھ پر مہربان ہے۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے پاس جوتا تو درکنار پاؤں بھی نہیں ہوتے لیکن پھر بھی زبان پر شکوہ نہیں لاتے۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہیلن کیلر کی طرح محرومیوں کو نعمت کہتے ہیں یہ وہی لوگ ہیں جو ناخوشگوار لمحوں کو ظاہر کرتی تصویروں کو کارٹون بنا کر ان پر رنجیدہ ہونے کی بجائے ہنسنے کا ہنر سیکھ لیتے ہیں جو آدھا خالی گلاس دیکھ کر خوش ہو جاتے ہیں۔ جو وقت کے تاریک جنگل سے ملنے والے جگنو جیسے ایک پل کو مٹھی میں قید کر کے ساری زندگی کو روشن کر لیتے ہیں جو زندگی کے تپتے صحرا میں اُڑتی ریت کا ذکر نہیں کرتے بلکہ اکا دُکا سایہ فراہم کرتے درختوں کی بات کرتے ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو ہر کٹھن اور مشکل لمحے میں اپنے آپ سے بہت ڈھیرے سے پر یقین انداز میں کہتے ہیں۔

''جو کرتا ہے اللہ کرتا ہے اور اللہ جو کرتا ہے، صحیح کرتا ہے''۔

ہم سب کچھ سیکھیں گے؟ پہلی قسم کے لوگوں سے نکل کر دوسری صف میں کھڑے لوگوں میں شامل ہونا ہمیں کب آئے گا؟ گلے شکوے، شکایات، ناشکری اور بے جا تقاضے سے نکل کر شکر گزاری اور تسلیم و رضا کے مرحلے میں ہم کب داخل ہوں گے؟ یہ وہ ڈھیر سارے سوالیہ نشان ہیں جن پر سوچنے کی اس لئے بھی ضرورت ہے تا کہ ہم نعمتوں کا ادراک اور اعتراف کر سکیں کیونکہ قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے۔

''اگر تم شکر کرو گے تو میں تمہارے لئے نعمتوں کو اور بڑھا دوں گا''۔

(بشکریہ نوائے وقت)

شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے

(ڈاکٹر وحید عشرت)

بیسویں صدی مسلمانوں کی غلامی اور استعمار سے لڑنے میں گزر گئی۔ اکیسویں صدی میں عالم اسلام اپنی نشاۃ ثانیہ کے لئے نئی کروٹیں لے رہا ہے۔ سترھویں اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں ملت اسلامیہ کا شیرازہ بکھرتا چلا گیا۔ بیسویں صدی میں عالمگیر سطح پر انہیں اپنے تشخص اور شناخت کو بچانے کی فکر ہوئی۔ مغربی تہذیب کی سیاسی ثقافتی، تعلیمی اور اقتصادی یلغار کا احساس ہوا اور اپنی تہذیب اور تمدن کے مٹ جانے کا خوف نظر آیا چنانچہ پوری دنیا میں مسلمانوں نے اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہو کر شدید ردعمل کا اظہار کیا۔ برصغیر میں شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ، شاہ اسمٰعیل شہیدؒ، سر سید احمد خانؒ، مولانا شبلی نعمانیؒ اور ان کے رفقاء، عالم اسلام میں ملکوں ملکوں میں بیداری کی لہر پیدا کرنے والے سید جمال الدین افغانیؒ، ترکی میں سعید حلیم پاشاؒ، توفیق فطرتؒ مصر میں مفتی محمد عبدہٗؒ، سعودی عرب میں محمد بن عبدالوہابؒ، سوڈان میں مہدی سوڈانیؒ اور وسطی ایشیاء میں امام شاملؒ جیسی عظیم شخصیتیں اپنے اپنے انداز سے متحرک ہوئیں۔ یوں لگتا تھا فکری اور ذہنی طور پر پورا عالم اسلام متحد اور متحرک ہو گیا ہے اور مسلمان ایک ملت کے قالب میں ڈھل گئے ہیں جن کے سامنے تین مقاصد تھے۔

1۔ مغرب کی اسلام کے خلاف مذہبی جنگ میں اسلامی عقائد و نظریات کا دفاع، اسلامی علوم کی اجتہاد کے ذریعے جدید تعبیر و تشکیل، اسلام کی تدریس اور تبلیغ کے لئے اداروں کا قیام اور مغرب کے شبہات کا ازالہ۔

2۔ مغربی علوم و فنون کی تدریس، ان کی زبانوں پر دسترس، ان کی کتب اور رسائل کا مطالعہ مغرب کی سائنس اور ٹکنالوجی کیلئے سکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں کا قیام۔

3۔ مسلمانوں کی سیاسی آزادی کیلئے عالمگیر جدوجہد، اس کیلئے سیاسی جماعتوں اور تنظیموں کا قیام، مسلمانوں میں عصری صورتحال کا شعور پیدا کرنا اور جنگ کے قدیم اور جدید طریقوں کو اپنانا اور اس کے لئے تمام حکمت عملیوں کو بروئے عمل لانا۔

حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ نے ان ہی بنیادوں پر 1907ء میں اپنی کوششوں کا آغاز کیا اس کے لئے ان کے پاس تین میڈیم تھے، شاعری، اردو اور انگریزی میں منتخب موضوعات پر نثر میں لکھنا اور خطوط نویسی کے ذریعے اظہار خیال۔ اس کا آغاز مارچ 1902ء کی اس غزل سے ہوتا ہے۔

کبھی جو آوارہ جنوں تھے، وہ بستیوں میں آ بسیں گے
برہنہ پائی وہی رہے گی، مگر نیا خار زار ہو گا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دکاں نہیں ہے
کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو، وہ اب زر کم عیار ہو گا
تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیاں بنے گا، ناپائیدار ہوگا
میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو
شرار فشاں ہو گی آہ میری نفس مرا شعلہ بار ہوگا

اس غزل میں اقبالؒ نے مسلمانوں کو پھر آباد اور اپنی برہنہ پائی کے باوجود معرکہ دین و وطن اور تہذیب وتمدن کے خارزار میں اترنے کی پیش گوئی کی کہ حجاز کے سکوت میں پھر اضطراب پیدا ہوگا یہ خاموشی اور سکوت مرگ آسا بھی، وقتی اور عارضی ہے کیونکہ عرب کے صحرائیوں کو خدا نے فتح مبین کی نوید سنائی تھی اور امت وسط اور خیر الامم قرار دیا تھا۔ اسے نئی دنیا کی سیادت اور امامت کا امین بنایا تھا چنانچہ انہوں نے دشت تو دشت دریا بھی نہیں چھوڑے اور قیصر اور کسریٰ کی سلطنتوں کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا۔ ان کے تخت الٹ دیئے تھے اور تاج اچھال دیئے تھے۔ اقبال کہتے ہیں کہ ان کی چشم بصیرت ان شیروں کے ہوشیار ہونے کا مستقبل میں منظر دیکھ رہی ہے۔

اس خوش خبری، عزم اور حوصلے اور مسلمانوں کے بیدار ہونے کی نوید دیتے ہوئے مسلمانوں پر چھائی ہوئی تہذیب، جس سے وہ مرعوب ہوتے دکھائی دیتے تھے اور جو اس وقت پوری دنیا

پر چھائی ہوئی تھی، کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس کی چمک دمک مصنوعی اور جھوٹے نگوں کی ریز کاری ہے وہ اہل مغرب کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہتے ہیں کہ مغرب کے رہنے والو تمہارا زر اور سونا کھرا نہیں، وقت کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا اس کا جھوٹ تم پر صاف ظاہر ہو جائے گا اور تمہاری یہ مصنوعی شیشہ گری پر مبنی تہذیب اپنے اخلاقی افلاس، نسلی تعصبات، سرمایہ دارانہ لوٹ کھسوٹ اور قوموں کو لوٹنے اور ان کا امن غارت کرنے کی وجہ سے خودکشی پر اتر آئے گی کیونکہ یہ اسلحہ کے انبار پر بیٹھی ہوئی ہے۔ مغربی تہذیب کے اس محاکمہ کے بعد کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو مغرب ناتواں چیونٹیوں کی طرح سمجھ کر کچل رہا ہے مگر یہی مورِ ناتواں یعنی چیونٹیاں اپنے کم وسائل جو برگ گل کی حثیت رکھتے ہیں، پھول کے اسی پتے کو یعنی اپنے محدود وسائل کو ہی اپنا سفینہ بنا لیں گے اور زمانے کی تندوتیز موجوں سے لڑتے بھڑتے دریا کے پار اترنے کی کامیابی حاصل کر لیں گے۔ مسلمانوں کی اس قدر کم مائیگی میں بھی وہ ان کی امید اور حوصلہ کو بلند اور قوی کرتے ہیں اور پھر اپنے کردار کا تعین کرتے ہیں کہ میں غلامی کی اس تاریک رات میں اپنے کارواں اور قافلہ سخت جاں کو لے کر نکلوں گا جس کیلئے میری آہ یعنی مری شاعری شعلے بھڑکائے گی اور میری زبان یعنی میرا نفس شعلے اگلے گا جو مسلمانوں کیلئے روشنی اور خرمن تہذیب حاضر کو خاکستر کرنے کا سامان ہو گا۔

یہ غزل نئی جنگ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کا منشور بن گئی۔ اس کے تحت اقبالؒ نے مسجد قوت الاسلام دہلی مسجد قرطبہ اور دیگر اسلامی آثار کی عظمت اور شکوہ کے بیان سے مسلمانوں کے شاندار ماضی کو اُبھارنا شروع کیا کہ ان میں احساس ہو کہ وہ ایک عظیم تہذیب اور تمدن کے وارث ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی فتوحات اور فاتحین طارق بن زیاد، محمود غزنوی، سلطان ٹیپو، اورنگ زیب عالمگیر اور احمد شاہ ابدالی کے کارناموں اور شخصیات کی تحسین و تعریف کی۔ اپنے خطبات میں مسلمان سائنس دانوں، حکما، فلسفیوں اور اہل ہنر کی ستائش کی۔ مسلمانوں کی شاعری اور ادب کی تحسین کی۔ یوں سطوت اسلام کو ہر پہلو سے نمایاں کیا کہ مسلمان ایک عظیم تہذب کے وارث ہیں۔ اُنہوں نے زوال مغرب کے جرمن مصنف فریڈرک اشپنگلر کے اس تصور کو رد کیا کہ مسلمان تہذیب کا احیا نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے یونانیوں کے سکونی نظریات کے بالمقابل

مسلمانوں کے حرکی تصورات کو اجاگر کیا۔

اقبالؒ نے اس مغربی تہذیب پر تنقید کی جس سے مسلمان ذہنی طور پر مرعوب نظر آتے ہیں۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ لینن خدا کے حضور میں اقبال نے مغرب پر شدید تنقید کی۔

یورپ میں بہت روشنی علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمہ حیواں ہے یہ ظلمات
رعنائی تعمیر میں، رونق میں ،صفا میں
گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات
ظاہر میں تجارت ہے ،حقیقت میں جوا ہے
سود ایک کا لاکھوں کیلئے مرگ مفاجات
یہ علم،یہ حکمت،یہ تدبر،یہ حکومت
پیتے ہیں لہو دیتے ہیں تعلیم مساوات
بے کاری و عریانی و مے خواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

پھراس کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں۔

وہ قوم کہ فیضان سماوی سے ہو محروم
حد اس کے کمالات کی ہے برق و بخارات
ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

پھراس بے ہنگم اور نمود و نمائش کی تہذیب پر تنقید کرتے ہیں۔

چہروں پہ جو سرخی نظر آتی ہے سر شام
یا غازہ ہے یا ساغر و مینا کی کرامات

پھر خدا سے گلہ مند ہوتے ہیں۔

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تری منتظر اے روز مکافات

اس سے آگے فرمان خدا میں یہ دعوت پیکار دیتے ہیں۔

اٹھو! مری دنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخ امرا کے در و دیوار ہلادو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے
کنجشک فرومایہ کو شاہین سے لڑا دو
سلطانی جمہور کا آتا ہے زمانہ
جو نقش کہن نظر آئے مٹادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلادو
تہذیب نوی کارگہ شیشہ گراں ہے
آداب جنوں شاعر مشرق کو سکھادو

اسلامی سطوت وجلالت اور مسلمانوں کے شاندار ماضی کے بیان اور مغربی تہذیب کو نوع انسانی کیلئے زہرناک قرار دینے کے بعد شاعر مشرق کا آداب جنوں، عصر حاضر میں مسلمانوں کے احیاء کے لئے ایک نیا معرکہ گرم کرتا ہے اور اس کا اظہار یوں کرتا ہے۔

تازہ میرے ضمیر میں معرکہ کہن ہوا
عشق تمام مصطفیٰ عقل تمام بولہب

وہ مسلمانوں کو اب ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے شکوہ جواب شکوہ کے ذریعے مسلمانوں کا خدا سے مکالمہ کرایا مسلمانوں کی نکبت، بربادی اور افلاس کا جواب ان کی اسلام سے دوری قرار دیا اور خدا کی زبان سے کہا۔

کی محمدؐ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

انہوں نے نبی پاک حضرت محمد ﷺ کو حصار اسلام کا مرکز قرار دیا:۔

مصطفیٰ برساں خویش را کہ دین ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

پھر اپنی نظم ذوق شوق میں نبی پاک ﷺ کو آید کائنات کا معنی دریاب قرار دیا اور پوری امت کو انؐ کے گرد اکٹھا کرنے کیلئے زبردست خراج عقیدت پیش کیا۔

لوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب
گنبد آبگینہ رنگ تیرے وجود میں حباب
شوکت سنجرو سلیم تیرے جلال کی نمود
فقر جنید و بایزید تیرا جمال بے نقاب

اپنے فارسی کلام میں بھی بحضور رسالت ﷺ، آپ میں انہی جذبات کا اظہار کیا اور نبی پاکؐ کو انسان کامل اور مرکز ملت قرار دیتے اور ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کرتے ہوئے انؐ کے گرد جمع ہونے اور انؐ سے محبت کرنے کا درس دیا یوں مسلمانوں کو ایک مرکز فراہم کیا جس کے گرد وہ اکٹھے ہوں:

ترے ضمیر پر جب تک نہ ہو نزول کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحب کشاف
گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

حضرت نبی پاکؐ اور قرآن کے گرد انہوں نے مسلمانوں کو بلانے کا کام شروع کیا۔ اقبالؒ نے ارسطو کے بے حرکت تصور خدا کے بالمقابل خدا کے سراپا حرکت ہونے کا تصور پیش کر کے مسلمانوں کے جامد وجود کو حرکت دی ان کے اندر تحرک اور زندگی پیدا کی حی و قیوم خدا پر ایمان کو استوار کیا۔ مسلمانوں کو حرکت و عمل کی طرف راغب کیا اور چلنا چلنا مدام چلنا کا فلسفہ پیش کیا جو مسلمانوں میں تبدیلی کا دروازہ کھولنے کا باعث بنا۔ فقہ و قانون میں اجتہاد کی بات کی۔ مسلمانوں کو عصر حاضر کے تقاضوں سے خود کو ہم آہنگ کرنے اور ان تقاضوں کے مطابق اپنی تشکیل و تعمیر کی بات کی۔

اقبال نے قیام یورپ کے دوران دیکھا کہ ان کے ہاں جنگ وجدال اور عالمگیر جنگ اور لڑائیوں کا سبب نیشنلزم ہے جوان کے نسلی اور لسانی تفاخر کے باعث ہے اور اسی نیشنلزم کی وجہ سے وہ مقبوضات اور منڈیوں کیلئے چھینا جھپٹی کرر ہے ہیں اور پوری انسانیت کو نیشنلزم اور وطنیت کے جہنم زار میں دھکیل رہے ہیں۔ انہوں نے مسلم خلافت کے خلاف سازش کر کے عربوں اور ترکوں اور ایرانیوں میں بانٹ کران کی طاقت توڑ دی! برصغیر میں بھی وطنیت اور نیشنلزم کا تخم بو کر اکھنڈ بھارت اور ہندوؤں کی بالا دستی کی سازش کی۔ نیشنلزم کے اس مغربی تصور کو رد کر کے اقبال نے مسلم نیشنلزم یا مسلم قومیت کا تصور پیش کیا۔ نظریہ قومیت اور وطنیت کو اسلام کے منافی قرار دیتے ہوئے فرمایا۔

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور
ساقی نے بنا کی روش لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور
تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور
ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
یہ بت کہ تراشیدہ تہذیب نوی ہے
غارت گر کا شانہ دین نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفویؐ ہے
نظارہ دیرینہ زمانے کو دکھادے
اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملادے
گفتار سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشاد نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اسی سے
قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اسی سے

اقبال نے مغربی نیشنلزم کے خلاف اپنے اس تیز اور جارحانہ حملے سے ایک نیا فلسفہ قومیت جنم دیا جس نے نہ صرف مغربی تصورات کی جڑ کاٹ دی بلکہ برصغیر میں مسلمانوں کو ایک نئے منشور، سیاسی نصب العین اور ہندو کے غلبہ کے خلاف اپنی جمعیت اور اتحاد کی بنیاد فراہم کردی۔ جس کو اپنا کر انہوں نے متحدہ قومیت کے خلاف برصغیر کے مسلمانوں کا لہو گرما دیا اور خطبہ الہٰ آباد اور قرارداد پاکستان کی روشنی میں پاکستان کی صورت میں مسلمانوں کی قوت ایک نئی اسلامی اور نظریاتی ریاست میں مجتمع ہوئی اور ایک ایسا خطہ ارضی انہیں مل گیا جہاں وہ اپنے مذہب اپنی ثقافت اور روایات کے مطابق اسلامی فلاحی اور نظریاتی ریاست قائم کر کے اپنے معاشی اور سیاسی تشخص کو قائم کر سکتے ہیں۔

اقبالؒ کے مسلم قومیت کے اسی تصور کے تحت پاکستان قائم ہوا اور قائد اعظم کی عظیم جدوجہد اور بصیرت نے اسے محسوس قالب عطا کیا مگر یہ ہماری بدنصیبی تھی کہ ہم قائد اعظم کی عظیم قیادت سے جلد ہی محروم ہو گئے جس کی بنا پر جاگیرداری اور انگریز کی چھوڑی ہوئی بیوروکریسی کا گٹھ جوڑ قائم ہو گیا۔ مسلم قومیت کے تصور کے تحت آئین سازی نہ ہوسکی پالیسی ساز ادارے تشکیل نہ پا سکے قائد اعظم نے کہا تھا کہ پاکستان کا آئین بنانے والا میں کون ہوں یہ تو چودہ سو سال پہلے بن گیا تھا یہ آئین ہمارے خوابوں میں ہی رہ گیا۔ اقبال نے کہا تھا کہ دستور جدید کے مطالعے اور اسلام کو تصور حیات بنانے سے عوام کی روٹی کا انتظام ہو سکے گا مگر وہ آج تک روٹی کے چند نوالوں کو بھی حاصل نہ کر سکے ان کے لبوں پر فریاد، جسم پر چیتھڑے اور پیٹ میں فاقے ہی رہے۔ قرارداد مقاصد تو پاس ہوئی مگر وہ آئین کا مقدس جزو ہی رہی۔ یہاں آئین کے سب سے بڑے علمبردار قائد اعظم کے ملک میں ہی آئین بنتے ٹوٹتے اور معطل ہوتے چلے آرہے ہیں۔ قائد اعظم کی سب سے پہلے حکم عدولی اس ملک کے فوجی سربراہ جنرل گریسی نے کشمیر میں فوجیں داخل نہ کر کے کی پھر جنرل ایوب خان خود ساختہ فیلڈ مارشل نے مشرقی پاکستان میں کی۔ جسٹس منیر نے حکمرانوں کے لئے نظریہ ضرورت ایجاد کیا اور قائد اعظم کے پرائیوٹ سیکرٹری ممتاز قانون دان نے اس نظریہ ضرورت کی ہر فوجی آمر کو بیساکھی فراہم کی۔ پاکستان کی خالق جماعت ہر آمر کی لونڈی بنی اور ٹکڑوں میں بٹتی رہی۔ یہاں سیاسی جماعتوں کو غیر مستحکم اور سیاسی قائدین کو رسوا ہونا پڑا بار بار جمہوری عمل کو تلپٹ کیا گیا۔ ملک اس وقت جاگیرداروں، نوکر شاہی اور عسکری

بیورو کریسی کے رحم و کرم پر ہے لیکن جیسا کہ اقبال نے کہا تھا کہ

عصر حاضر کے تقاضوں سے ہے لیکن یہ خوف
ہو نہ جائے آشکار شرع پیغمبر کہیں

پاکستان اور عالم اسلام اکیسویں صدی میں ایک نئے انقلاب کو رستخیز کہتا ہوا نظر آتا ہے۔ امریکی دانشور سموئیل پی ہننگٹن نے اپنی کتاب ,تہذیبوں کے تصادم، میں 1993ء میں اسلام اور چین کو امریکی تہذیب کے لئے خطرہ قرار دیا ہے جبکہ اقبال نے تو 1935ء سے پہلے کہہ دیا تھا کہ

گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے ابلنے لگے

اور اشتراکیت کے انہدام کی پیش گوئی کرتے ہوئے کہا تھا کہ

ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتساب کائنات
خال اس قوم میں اب تک نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشک سحر گاہی سے جو ظالم وضو
جانتا ہے جس پر روشن باطن ایام ہے
مزدکیت فتنہ فردا نہیں اسلام ہے

سموئیل پی ہننگٹن سے بہت پہلے اقبال کو شعور تھا کہ اشتراکیت مٹ جائے گی اور مغربی تہذیب کا فائنل راؤنڈ اسلامی تہذیب سے تصادم کا ہوگا۔امریکی تھنک ٹینک، سیاسی مدبر و مبصر اور دانشور روس کو شکست دینے کیلئے بھی ہمارا محتاج ہے۔ ہماری قیادت سے غلطی یہ ہوئی کہ وہ روس سے کسی قیمت پر مفاہمت نہ کر سکے اور اسے قندھار کے راستے سے گرم پانیوں تک کوئی موٹر وے نہ دے سکے تاکہ دنیا سے دو طاقتی توازن ختم نہ ہوتا مگر جنگ کا اتنا فائدہ تو ہوا کہ وسط ایشیائی مسلم ریاستیں آزاد ہوئیں۔ انہیں نیا تشخص ملا اور ہمارا مکار امریکی دوست ہم پر عیاں ہو گیا۔ طالبان امن اور آزادی کے دشمن بن گئے اور ان پر ہماری لاجسٹک سپورٹ سے آتش و آہن کی بارش ہوئی جس سے پورا عالم اسلام ششدر رہ گیا۔ افغانستان کے بعد عراق میں امریکی آپریشن اور بش کے کروسیڈ وار کہنے سے عالم اسلام کی آنکھیں کھل گئیں۔ اب پورا عالم اسلام مسلم تہذیب کے بچاؤ کے محاذ پر ہے اور مغرب اپنی تہذیب کے تحفظ اور بچاؤ کے لئے مسلمانوں کو ایک ایک کر کے تہ تیغ کر رہا ہے۔ امریکی صدر نے خود ہی روشن خیالی اور اعتدال

پسندی کی دھجیاں اڑادی ہیں اقبال نے یہ جو کہا تھا کہ

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کیلئے
نیل کے ساحل سے لیکر تابخاک کاشغر

وہ صورت حال اب پیدا ہوگئی ہے۔ پوری دنیا کے مسلمان اس محاذ پر آ گئے ہیں اس لئے کہ اقبال نے کہا تھا کہ

اک ولولہ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تاخاک بخارا و سمر قند

اقبال نے مسلم روس کی بیداری اور آزادی کی بھی پیش گوئی کی تھی اور افغانستان کے بارے میں کہا کہ

کوہسار باقی افغانی باقی
الحکم اللہ الملک اللہ

عالم اسلام پر جب بھی افتاد آئی وہ یک جاں ہو کر متحد ہوگیا۔ روس کے خلاف جنگ میں سارا عالم اسلام متحد ہو کر لڑا۔ خلافت کی بحالی کے لئے برصغیر کے مسلمانوں نے زبردست آواز اٹھائی فلسطینیوں کے حقوق اور اسرائیل کے قیام اور اس کی جارحیت کے ساتھ پورا عالم اسلام سیسہ پلائی دیوار بن گیا۔ نہر سویز کی لڑائی میں جب مصر پر امریکہ، برطانیہ اور فرانس ٹوٹ پڑے تو سارا عالم اسلام مصر کی پشت پر تھا۔ شط العرب کی مسلط کردہ جنگ میں بھی یہی حال تھا اور اب عراق میں امریکہ اور اتحادیوں کے مظالم پر بھی یک زبان ہے۔ ایران کو دھمکیوں کے خلاف بھی عالم اسلام متحد ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ

اُٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے

اور اقبال پھر خود ہی یہ نوید سناتے ہیں کہ

شب گریزاں ہوگئی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

حرب اسلامی اور دفاع پاکستان

(کرنل فضل ربی)

غزوہ بدر

غزوہ بدر رمضان المبارک ۲ھ

وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ٥ (123:3)

اور اللہ تعالیٰ نے جنگ بدر میں تمہاری مدد فرمائی۔ جب تم نہایت گری ہوی حالت میں تھے۔ پس اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہوتا کہ تم شکر گزار بنو۔

جنگ بدر (رمضان المبارک ۲ھ) قریش اور اسلام کے درمیان پہلی با قاعدہ اور فیصلہ کن جنگ تھی۔ فریقین کی تعداد کے لحاظ سے یہ جنگ چھوٹی تھی۔ مگر اس کے نتائج دنیا کی عظیم ترین فیصلہ کن جنگوں سے زیادہ موثر، دیرپا اور حیران کن ہیں۔ اس جنگ نے تاریخ کا رُخ بدل دیا۔ مشرکین کی تعداد ایک ہزار اور مسلمانوں کی تعداد تین سو تیرہ تھی۔ مسلمان سپاہ کی قیادت نبی کریمؐ اور کفار کی قیادت ابو جہل کے ہاتھوں میں تھی۔ اس غزوہ میں چودہ صحابہ کرامؓ شہید ہوئے جبکہ کفار کے ستر آدمی ہلاک ہوئے اور اتنے ہی قیدی بنائے گئے۔

نبی کریم ﷺ نے اللہ کی راہ میں اس پہلے با قاعدہ غزوے میں جو دفاعی پہلو اختیار فرمائے اس کی تفصیل یوں ہے:۔

اقدام

مدینہ میں رہ کر دفاعی جنگ لڑنے کے بجائے نبی کریم ﷺ نے اپنے علاقہ سے نکل کر اسی (۸۰) میل دور واقع بدر کے میدان میں دشمن کا سامنا کیا۔ سالار اعظم ﷺ صحابہ کرامؓ کو لے کر ابوسفیان کے قافلے کو روکنے کیلئے نکلے۔ ابوسفیان نے عام شاہراہ سے ہٹ کر سمندر کے کنارے کنارے قافلے کو بحفاظت مسلمانوں کی زد سے نکال دیا۔ ابوسفیان کے قافلے کے بحفاظت نکلنے کے بعد قریشی لشکر کے مقابلے کے لئے نبی کریم ﷺ نے اسی نفری اور سامان حرب کے ساتھ بدر کی طرف پیش قدمی کر کے اپنی سرزمین کو دشمن کی تباہ کاریوں سے بچالیا اور اپنے محدود وسائل کو دشمن پر ضرب کے لئے استعمال کیا نہ کہ مدینہ شہر کے دفاع کیلئے۔

گشتی دستے!(Patrol Parties)

بدر کے میدان میں جاتے وقت نبی کریم ﷺ نے مختلف اطراف سے دستے بھیجے تا کہ ان دستوں کی مدد سے نبی کریم ﷺ کو دُشمن سے متعلق کوائف معلوم ہو جائیں۔ چنانچہ حضرت انسؓ سے مروی ایک طویل حدیث میں مروی ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں۔ رسُول اللہ ﷺ نے مشورہ کیا جب نبی کریم ﷺ کو ابوسیفان کے آنے کی خبر پہنچی تو ابوبکرؓ نے گفتگو کی۔ نبی کریم ﷺ نے جواب نہ دیا۔ پھر حضرت عمرؓ نے گفتگو کی۔ جب بھی نبی کریم ﷺ مخاطب نہ ہوئے آخر سعد بن عبادہؓ (انصار کے رئیس) اُٹھے اور انہوں نے کہا آپؐ ہم سے پوچھتے ہیں یارسول اللہ ﷺ قسم خدا کی اگر نبی کریم ﷺ ہم کو حکم دیں کہ ہم گھوڑوں پر سمندر میں کود جائیں تو کود جائیں اور اگر آپ ہمیں حکم دیں کہ گھوڑوں کو بھگا دیں برک الغماد تک البتہ ہم ضرور بھگا دیں۔ تب رسول اللہ ﷺ نے لوگوں کو بلایا اور وہ چلے یہاں تک کہ بدر میں اُترے وہاں قریش کے پانی پلانے والے ملے اِن میں بنی حجاج کا ایک کالا غلام بھی تھا۔ صحابہؓ نے اس کو پکڑا اور اِسی سے ابوسفیان اور اِس کے ساتھیوں کا حال پوچھنے لگے۔ (صحیح کتاب الجہاد)

اِن دونوں کو نبی کریم ﷺ کے پاس لے جایا گیا سردار اعظم نے ان سے مقابل فوج کی تعداد اور حصہ لینے والے سرداروں کے نام معلوم کیے۔

ان معلومات کے مطابق نبی کریم ﷺ نے مناسب اقدامات کیے اور دفاعی اعتبار سے مضبوط پوزیشن حاصل کر کے لڑائی کیلئے منصوبہ بندی فرمائی۔

میدان جنگ کا چناؤ(SELECTION OF BATTLE-FIELD)

بدر کے میدان میں نبی کریم ﷺ نے ایسے مقام کا انتخاب کیا؟ جو جغرافیائی نقطہ نظر سے سطح مرتفع پر تھا۔ جہاں پر پہنچنے کے لئے دشمن کو ریت کے ٹیلوں سے گزرنا پڑتا تھا۔ اِس مقام کا ذکر قرآن پاک کے اندر اِن الفاظ میں ہوا۔

اِذْ اَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوٰى وَالرَّكْبُ اَسْفَلَ مِنْكُمْ o (42:8)

جس وقت تم درے کے قریب والے کونے پر تھے اور وہ دور والے کونے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے کی طرف تھا۔

جنگ کے لئے اپنی پسند کا مقام حاصل کرنا گویا دشمن کے ہاتھ سے پہل (INITIATIVE)

لینا ہے، اپنی پسند کے میدان جنگ میں دشمن کو لانے سے اسلامی عساکر کو مندرجہ ذیل فوائد حاصل ہوئے۔

- اس اونچے مقام سے دشمن کی نقل وحرکت کا آسانی سے مشاہدہ ہوسکتا تھا۔
- اُونچے مقام پر سپاہ کے لئے دفاعی مورچہ مہیا ہوا۔
- پوزیشن کے ساتھ پانی وافر تھا۔لہٰذا جنگ کے دوران پانی کی سپلائی بدستور قائم رہی۔
- رات کی بارش سے نشیبی علاقے میں پانی کھڑا ہوا جس کی وجہ سے دشمن کے لئے نقل و حرکت مشکل ہوگئی۔
- حملے کے وقت سورج کی شعاعیں مسلمانوں کے عقب اور کفار کے بالکل سامنے تھیں جس سے دشمن کی آنکھیں چوندھیا جاتی تھیں اور وہ جم کر نہ لڑ سکے۔

وحدت قیادت

بدر میں پہنچنے کے بعد نبی کریم ﷺ نے مسلمانوں کو نظم وضبط کی تلقین فرمائی اپنی جگہ سے بلا اجازت نہ ہلنے اور نبی کریم ﷺ کے حکم کے بغیر حملہ نہ کرنے کا حکم دیا۔ نبی کریم ﷺ نے متحدہ کمان اور فائر کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا۔ اس مقصد کے لئے نبی کریم کیلئے ایک ٹیلے پر عریش (جھونپڑی) بطور کمانڈ پوسٹ قائم کی گئی۔ جہاں سے میدان جنگ کی پوری کاروائی آپ (ﷺ) کی نگاہوں کے سامنے تھی۔ اس کے مقابلے میں دشمن کی فوج ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ کچھ لوگ تو ابوسفیان کے قافلے میں تھے، کچھ اِن کی مدد کیلئے گئے۔ یہ دونوں قسم کے لوگ غزوہ بدر میں بالکل حصہ نہ لے سکے۔اور باقی ماندہ فوج میں بھی پھوٹ پڑ گئی تھی اور ابوجہل کے علاوہ اکثر سردار لڑائی کے حق میں نہیں تھے جس میں عتبہ بھی شامل تھا۔ چنانچہ حضرت حکیم ابن حزام جو اِس وقت اسلام نہیں لائے تھے اور کفار کی طرف سے غزوہ بدر میں شریک تھے۔ روایت کرتے ہیں کہ میں عتبہ کے پاس گیا اور اِسے کہا:۔

اے ابوولید تو قریش کا رئیس ہے۔ یہ سب تیری بات مانتے ہیں کیا تجھے اِس بات سے کچھ رغبت ہے کہ ہمیشہ اِن میں تیرا ذکر خیر رہے۔ اِس نے کہا اے حکیم وہ کیا بات ہے کہا تو سب لوگوں کو لے کر لوٹ جا۔اور عمرو بن الحضرمی جو تیرا حلیف ہے اِس کا بار خود اُٹھالے۔ (ابن اثیر)

نبی کریم ﷺ کی اِس حکمت عملی کے طرز پر سپاہ کے اندر پختگی ایمان کی بدولت اتحاد و یگانگت کے جذبہ پیدا کرنا ضروری ہے تاکہ وہ سب ایک علم (جھنڈے) کاز (مقصد) اور جذبے کے ساتھ لڑ سکیں اِسی طرح کمانداروں کے لئے مناسب جگہ پر ٹیکٹیکل ہیڈ کوارٹرز (جنگی دفاتر)

قائم کرنے ضروری ہیں تا کہ وہ لڑائی کی ہر چھوٹی بڑی کاروائی بنفس نفیس ملاحظہ کرتے ہوئے بروقت فیصلے کرسکیں۔

صف بندی

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ بدر میں مروجہ طریقہ جنگ کے خلاف اپنی فوج کی صف بندی فرمائی۔ لشکر کیلئے تین مقامات دایاں، بایاں اور مرکز تعین کئے دائیں اور بائیں بازو پر دور مار ہتھیار (تیراندازوں) کو رکھا۔ جب کہ درمیان میں تلوار برداروں کو کھڑا کیا۔ آج کل بھی صفوں کی ترتیب انہی اصولوں پر کی جاتی ہے۔ یعنی انفنٹری (پیدل فوج) حملہ کی صورت میں لائٹ مشین گن (LMG) اور مشین گن (MG) کو ہمیشہ بازووں (FLANKS) پر رکھتی ہے۔

غزوہ بدر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے میمنہ (RIGHT FLANK) پر حضرت ابوبکرؓ صدیق کو مقرر کیا اور ساقہ (LEFT FLANK) پر ایک انصاری کو امیر بنایا۔ اس ترتیب کے بعد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دست مبارک میں تیر لے کر مسلم عساکر کی صف بندی فرمائی چنانچہ روایت ہے۔

حمزہ ابن اسیدؓ کے والد کہتے ہیں کہ حضورؐ نے جنگ بدر میں جب ہم قریش کے خلاف صف آراء تھے اور قریش ہمارے خلاف فرمایا جب وہ تمہارے قریب آجائیں اس وقت تیر مارو۔

(صحیح بخاریؒ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن اپنے اصحاب کی صفیں درست فرمائیں اور آپؐ کے ہاتھ میں ایک تیر تھا جس سے لوگوں کو (صف میں) درست فرما رہے تھے جب آپؐ بنی عدی بن النجار کے حلیف سواد بن غزیہ کے پاس سے گزرے تو آپؐ نے ان کے پیٹ میں وہ تیر چھویا اور فرمایا **اِستویا سواد** (اے سواد برابر ہو جاؤ)۔

اِس کے برعکس کفار مکہ کی کوئی صف بندی نہیں تھی۔ اور بھیڑ بکریوں کے ریوڑ کی طرح اِدھر اُدھر بھاگتے رہے۔ صف بندی کے عمل سے مسلم فوج کا دفاع خود بخود عمل میں آیا۔ اور دشمن کے حملے کی پہل لہر (WAVE) کے گزرنے کے بعد ان کے لیے پہل کی کاروائی آسان ہوگئی۔

فائر کنٹرول (FIER CONTROL)

عین لڑائی کے دوران فریقین اکثر بلاضرورت فائر کرتے ہیں۔ یہ فائر اکثر یقین کے بجائے شک وشبہ کی بناء پر ہوتا ہے جس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ اس سے پوزیشن کے محل وقوع، نفری اور اسلحے کی نوعیت کا پتہ چلتا ہے۔ نیز دشمن کو نقصان پہنچائے بغیر بارود کا بے جا ضیاع ہوتا ہے۔ غزوہ بدر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا تھا کہ جب تک سیاہ کی آنکھ کی سفید پُتلی نظر نہ

آئے، اِن پر تیر اندازی نہ کی جائے۔ جسے آج کل (SHOOT TO KILL) کہا جاتا ہے۔
چنانچہ روایت ہے۔

عَنْ اَبِیْ اُسَیْدٍ قَالَ قَالَ لَنَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صلی اللہ علیہ وسلم یَوْمَ بَدْرٍ اِذَا اَکْثَبُوْکُمْ فَارْمُوْھُمْ وَاسْتَبْقُوْا نَبْلَکُمْ۔ (صحیح بخاری)

حضرت ابواسیدؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کے دن ہم لوگوں سے فرمایا۔ جب کافر تمہارے قریب آجائیں اِس وقت تیر مارو اور اپنے تیروں کو بچائے رکھو۔

اِسی طرح حکم تھا کہ جب دشمن بالکل نیزے اور تلوار کی زد میں آئے تو وار کیا جائے۔ تاکہ کوئی وار خطا نہ جائے۔ اِس کے برعکس کفار تیر اندازوں نے بہت دور ہی سے تیر برسانے شروع کر دیئے تھے۔ جو کہ سب بے کار ثابت ہوئے اور ضرورت کے وقت تیر تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ آج بھی میدان جنگ میں لڑنے والی (FIGHTING ARMY) فوج کے دفاع کیلئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز کردہ فائر کنٹرول نہایت کارگر ہے۔

رازداری

حق و باطل کے اِس پہلے معرکے میں دونوں مدمقابل افواج شکل و مشابہت، خدوخال، لباس اور زبان وغیرہ کے اعتبار سے مشابہ تھیں۔ اتنی گہری مشابہت کے ہوتے ہوئے دوست و دشمن میں تمیز کرنے کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلی دفعہ اپنی فوج کے لیے خفیہ کلمات (CODE WORD) کا استعمال کیا لڑائی کے دوران کوڈ ورڈ اور پاس ورڈ کا استعمال فوجی تاریخ میں پہلی دفعہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بدولت ہوا۔ لہٰذا جنگ بدر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''احد'' بطور کوڈ ورڈ اور ''یا منصور اَمِت'' پاس ورڈ مقرر فرما کر میدان جنگ میں نہایت رازداری سے کام لیا۔ خفیہ کلمات مقرر فرمانے کے علاوہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دشمن سے متعلق تمام راز حاصل کیے جن میں دشمن کے متعلق پڑاؤ کی جگہ اور تعداد کو اہمیت حاصل ہے۔ اس غرض کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ سے قبل اور پڑاؤ کے بعد باقاعدگی کے ساتھ گشتی دستے (PATROL PARTIES) روانہ کیے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑاؤ کے فوراً بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ اور حضرت زبیرؓ اور سعد بن ابی وقاصؓ کو چاہ بدر پر بھیجا ان لوگوں کو قریش کی پانی بھرنے والی جماعت ملی جن میں ان کے پانی پلانے والے بھی تھے ان لوگوں نے اس جماعت کو گرفتار کرلیا۔ اس طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اونٹوں کے گلے سے گھنٹیاں اتار دی گئی تھی۔ تاکہ حرکت پذیری کا علم دشمن کو نہ ہوسکے۔

قرآن خدا کی آواز

(مولانا وحید الدین خاں)

۲۔قرآن کی دوسری پیشین گوئی جس کا میں یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں، وہ رومیوں کا ایرانیوں پر غلبہ ہے جو قرآن کی تیسویں سورہ (روم) میں وارد ہوئی ہے:۔

غلبت الروم فی ادنی الارض وهم من بعد غلبهم سيغلبون○

(32 آیت)

جزیرہ نمائے عرب کے مشرق میں خلیج فارس کے دوسرے ساحل پر ایرانی حکومت قائم تھی اور مغرب میں بحر احمر کے کناروں سے لے کر اوپر بحر اسود تک وہ سلطنت تھی، جو تاریخ میں سلطنت روم کے نام سے مشہور ہے، اول الذکر کا دوسرا نام ساسانی سلطنت اور موخر الذکر کا بازنطینی سلطنت ہے، ان دونوں حکومتوں کی سرحدیں عرب کے شمال میں عراق کے مشہور دریاؤں دجلہ و فرات پر آ کر ملتی تھیں، یہ دونوں اپنے زمانے کی طاقتور سلطنتیں تھیں، رومی سلطنت کی تاریخ مورخ گبن کے بیان کے مطابق دوسری صدی عیسوی سے شروع ہوتی ہے اور اس کو اپنے وقت کی مہذب ترین سلطنت کی حیثیت حاصل رہی ہے۔

روم کے زوال پر جتنا لکھا گیا ہے، اتنا کسی تہذیب کے خاتمے پر نہیں لکھا گیا اور اگرچہ کوئی ایسی کتاب نہیں ہوسکتی جو دوسری تمام کتابوں سے آدمی کو مستغنی کر دے، تاہم مجموعی اعتبار سے اس عنوان پر سب سے زیادہ مفصل اور معتمد مواد اڈورڈ گبن (EDWARD GIBBON) کی مشہور کتاب ہے جس کا نام ہے:۔

THE HISTORY OF THE DECLINE AND FALL OF THE ROMAN EMPIRE.

اس کتاب کی پانچویں جلد کے دوسرے باب میں قابل مصنف نے اس دور کے واقعات قلم بند کئے ہیں، جو اس وقت ہمارا موضوع بحث ہے، روم کے ایک سابق بادشاہ قسطنطین نے ۳۲۵ء میں مسیحیت قبول کر کے اس کو سرکاری مذہب کی حیثیت دے دی تھی، چنانچہ روم کی بیشتر آبادی اب حضرت عیسیٰ کی پیرو تھی، اس کے مقابلے میں ایرانی سورج دیوتا کے پرستار تھے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے روم پر جس بادشاہ کی حکومت تھی، اس کا نام ماریس (MAURICE) تھا، ماریس کی نااہلی اور بد انتظامی کی وجہ سے آپؐ کو نبوت ملنے سے آٹھ سال قبل ۶۰۲ء میں اس کی فوج نے اس کے خلاف بغاوت کر دی، اس بغاوت کی قیادت ایک فوجی کپتان فوکاس

(PHOCAS) نے کی تھی، بغاوت کامیاب ہوگئی اور فوکاس روم کے شہنشاہ کی جگہ تخت پر قابض ہوگیا۔ اس نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد شہنشاہ روم ماریس اور اس کے خاندان کو نہایت بے دردی کے ساتھ قتل کر دیا۔

فوکاس نے اپنی ہمسایہ سلطنت ایران کو ایک سفیر بھیج کر اپنی تخت نشینی کی اطلاع دی، اس وقت ایران کے تخت پر نوشیرواں عادل کا لڑکا خسرو پرویز (CHOSROES II) تھا، خسرو پرویز کو ۵۹۰-۹۱ء میں اندرونی سازش اور بغاوت کی وجہ سے اپنے ملک سے فرار ہونا پڑا تھا، اس زمانے میں مقتول رومی شہنشاہ ماریس نے اس کو اپنے علاقہ میں پناہ دی تھی، اور دوبارہ قبضہ حاصل کرنے کے سلسلے میں اس کی مدد کی تھی، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ انہیں دنوں قسطنطنیہ کے زمانہ قیام میں خسرو نے ماریس کی لڑکی سے شادی کر لی تھی، اور اس رشتہ کی بنا پر ماریس کو اپنا باپ کہتا تھا، چنانچہ جب خسرو کو رومی انقلاب کی خبر ملی تو وہ سخت برہم ہوا، اس نے رومی سفیر کو قید کرا دیا، اور نئی حکومت کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد فوراً اس نے اپنی فوجوں کے ذریعے روم پر چڑھائی کر دی، ۶۰۳ء میں اس کی فوجیں دریائے فرات کو پار کر کے شام کے شہروں میں داخل ہوگئیں۔۔۔فوکاس اپنی نااہلی کی وجہ سے اس غیر متوقع حملہ کو روکنے میں کامیاب نہ ہوا، ایرانی فوجیں بڑھتی رہیں۔ یہاں تک کہ انطاکیہ کو فتح کرتے ہوئے یروشلم پر قابض ہوگئیں۔ ایرانی سلطنت کے حدود فرات سے پار کر کے یکایک وادی نیل تک وسیع ہو گئے، سابقہ رومی سلطنت کے مذہبی داروگیر کی وجہ سے چرچ کے مخالف فرقے نسطوری اور یعقوبی نیز یہودی پہلے سے رومی حکومت سے ناراض تھے، اب انہوں نے روم دشمنی میں نئے فاتحین کا ساتھ دیا، اس چیز نے خسرو کی کامیابی کو بہت آسان بنا دیا۔

فوکاس کی ناکامی دیکھ کر بعض اعیان سلطنت نے افریقی مقبوضہ کے رومی گورنر کے یہاں خاموش پیغام بھیجا کہ وہ ملک کو بچانے کی کوشش کرے، اس نے اپنے لڑکے ہرقل (HERACLIUS) کو اس مہم پر روانہ کیا، ہرقل سمندر کے راستہ سے فوج لے کر افریقہ سے روانہ ہوا، اور یہ ساری کاروائی اس قدر راز داری کے ساتھ انجام پائی کہ فوکاس کو اس وقت تک اس کی خبر نہیں ہوئی جب تک اس نے اپنے محل سے سمندر میں آتے ہوئے جہازوں کے نشانات نہیں دیکھ لئے، ہرقل معمولی لڑائی کے بعد دارالسلطنت پر قابض ہوگیا اور فوکاس قتل کر دیا گیا۔

ہرقل نے فوکاس کو تو ختم کر دیا، مگر ایرانی سیلاب کو روکنے میں کامیاب نہ ہوسکا، ۶۱۶ء تک رومی دارالسلطنت سے باہر اپنی شہنشاہی کا تمام مشرقی اور جنوبی حصہ کھو چکے تھے، عراق، شام،

فلسطین، مصر، ایشیائے کوچک، ہر جگہ صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی لہرا رہا تھا، رومی سلطنت قسطنطنیہ کی چہار دیواری میں محدود ہو کر رہ گئی تھی، محاصرہ کی وجہ سے تمام راستے بند تھے، چنانچہ شہر میں قحط اور وبائی امراض نے پھیل کر مزید مصیبت پیدا کر دی، رومی سلطنت کے عظیم الشان درخت کا صرف تنا باقی رہ گیا تھا، اور وہ بھی خشک ہو رہا تھا، خود قسطنطنیہ کے اندر دشمن کے گھس آنے کا خوف تمام آبادی پر اس قدر چھایا ہوا تھا کہ تمام کاروبار بند تھے، وہ پبلک مقامات جہاں رات دن چہل پہل رہتی تھی، اب سنسان پڑے ہوئے تھے۔

آتش پرست حکومت نے علاقہ پر قبضہ کرنے کے بعد مسیحیت کو مٹانے کیلئے شدید ترین مظالم شروع کئے، مذہبی شعائر کی توہین شروع کی گئی، گرجا گھر مسمار کر دیئے گئے، تقریباً ایک لاکھ عیسائیوں کو بے گناہ قتل کر دیا ہر جگہ آتش کدے تعمیر کئے گئے اور مسیح کے بجائے آگ اور سورج کی جبری پرستش کو رواج دیا گیا مقدس صلیب کی اصل لکڑی جس کے متعلق عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اس پر مسیح نے جان دی تھی، وہ چھین کر مدائن پہنچا دی گئی۔

مورخ گبن کے الفاظ میں:۔

''اگر خسرو کے مقاصد واقعی نیک اور درست ہوتے تو وہ باغی فوکاس کے خاتمہ کے بعد رومیوں سے اپنے جھگڑے کو ختم کر دیتا اور افریقی فاتح کا اپنے بہترین ساتھی کی حیثیت سے استقبال کرتا جس نے نہایت خوبی کے ساتھ اس کے محسن ماریس کا انتقام لے لیا تھا، مگر جنگ جاری رکھ کر اس نے اپنے اصل کردار کو نمایاں کر دیا''۔ (ص ۷۴)

اس وقت ایرانی شہنشاہیت اور رومی سلطنت میں کیا فرق پیدا ہو چکا تھا اور ایرانی فاتح اپنے کو کتنا بڑا سمجھنے لگا تھا، اس کا اندازہ خسرو پرویز کے اس خط سے ہوتا ہے، جو اس نے بیت المقدس سے ہرقل کو لکھا تھا:۔

''سب خداؤں سے بڑا خدا، تمام روئے زمین کے مالک خسرو کی طرف سے اس کے کمینہ اور بے شعور بندے ہرقل کے نام تو کہتا ہے کہ تجھے اپنے خدا پر بھروسہ ہے، کیوں نہ تیرے خدا نے یروشلم کو میرے ہاتھ سے بچا لیا''۔

ان حالات نے قیصر روم کو بالکل مایوس کر دیا اور اس نے طے کر لیا کہ اب وہ قسطنطنیہ چھوڑ کر بحری راستہ سے اپنے جنوبی افریقہ کی ساحلی قیام گاہ میں چلا جائے جو قرطاجنہ (CARTHAGE) موجودہ تیونس میں واقع تھی، اب اس کے سامنے ملک کو بچانے کے بجائے اپنی ذات کو بچانے کا مسئلہ تھا۔ شاہی کشتیاں محل کے خزانوں سے لادی جا چکی تھیں، مگر عین وقت

پر رومی کلیسا کے بڑے پادری نے اس کو مذہب کا واسطہ دے کر روکنے میں کامیابی حاصل کر لی، وہ اس کو سینٹ صوفیا کی قربان گاہ پر لے گیا، اور اس کو آمادہ کیا کہ وہاں وہ اس بات کا عہد کرے کہ وہ اپنی اس رعایا کے ساتھ جئے گا یا مرے گا جس کے ساتھ خدا نے اس کو وابستہ کیا ہے، (صفحہ ۷۵)

اسی دوران میں ایرانی جنرل سین (SAIN) نے تجویز کیا کہ ہرقل ایک صلح کا قاصد شہنشاہ ایران کی خدمت میں روانہ کرے، اس کو ہرقل اور اس کے مشیروں نے بڑی خوشی سے قبول کیا، مگر جب شہنشاہ ایران خسرو پرویز کو اس کی خبر پہنچی تو اس نے کہا:۔

''مجھ کو یہ نہیں، بلکہ خود ہرقل زنجیروں میں بندھا ہوا میرے تخت کے نیچے چاہیے، میں رومی حکمران سے اس وقت تک صلح نہیں کروں گا، جب تک وہ اپنے صلیبی خدا کو چھوڑ کو ہمارے سورج دیوتا کی پرستش نہ کرے''۔ (صفحہ ۷۶)

تاہم چھ سالہ لڑائی نے بالآخر ایرانی حکمران کو مائل کیا کہ وہ فی الحال کچھ شرائط پر صلح کر لے، اس نے شرط پیش کی۔

''ایک ہزار ٹالنٹ سونا، ایک ہزار ٹالنٹ چاندی، ایک ہزار ریشمی تھان، ایک ہزار گھوڑے ایک ہزار کنواری لڑکیاں''۔

گبن ان شرائط کو بجا طور پر شرمناک شرائط (IGNOMINIOUS TERMS) کہتا ہے، ہرقل یقیناً ان شرائط کو قبول کر لیتا، مگر جتنی مدت میں اور جس چھوٹے سے لٹے ہوئے علاقہ سے اس کو ان قیمتی شرائط کی تکمیل کرنی تھی، اس کے مقابلے میں اس کیلئے زیادہ قابل ترجیح بات یہ تھی کہ وہ انہیں ذرائع کو دشمن کے خلاف آخری حملہ کی تیاری کیلئے استعمال کرے۔

ایک طرف یہ واقعات ہو رہے تھے، دوسری طرف ایران و روم کے درمیان عرب کے مرکزی مقام ''مکہ'' میں ان واقعات نے ایک اور کشمکش پیدا کر دی تھی، ایرانی سورج دیوتا کو مانتے تھے، اور آگ کی پرستش کرتے تھے، اور رومی وحی و رسالت کے ماننے والے تھے، اس لئے نفسیاتی طور پر اس جنگ میں مسلمانوں کی ہمدردیاں رومی عیسائیوں کے ساتھ تھیں اور مشرکین مظاہر پرست ہونے کی وجہ سے مجوسیوں سے اپنا مذہبی رشتہ جوڑتے تھے، اس طرح روم و ایران کی کشمکش اس کشمکش کا ایک خارجی نشان بن گئی جو مکہ میں اہل اسلام اور کفار و مشرکین کے درمیان جاری تھی، دونوں گروہ سرحد پار کی اس جنگ کے انجام کو خود اپنی باہمی کشمکش کے انجام کی ایک علامت سمجھنے لگے، چنانچہ ۶۱۶ء میں جب ایرانیوں کا غلبہ نمایاں ہو گیا اور رومیوں کے تمام مشرقی علاقے ایرانیوں کے قبضہ میں چلے گئے، اور اس کی خبریں مکہ پہنچیں تو اسلام کے مخالفین نے اس موقع سے

فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہنا شروع کیا کہ دیکھو ہمارے بھائی تمہارے جیسا مذہب رکھنے والوں پر غالب آ گئے ہیں، اسی طرح اپنے ملک میں بھی ہم تم کو اور تمہارے دین کو مٹا کر رکھ دیں گے، مکہ کے مسلمان جس بے بسی اور کمزوری کی حالت میں تھے، اس میں یہ الفاظ ان کے لئے زخم پر نمک کا کام کرتے تھے، عین اس حالت میں پیغمبر خدا کی زبان سے یہ الفاظ جاری کئے گئے۔

غلبت الروم فی ادنی الارض وهم من بعد غلبهم سيغلبون فی بضع سنين لله الامر من قبل ومن بعد و يومئذ يفرح المومنون ○ بنصر الله ينصر من يشاء وهو العزيز الرحيم ○ وعد الله لا يخلف الله وعده ولكن اكثر الناس لا يعلمون ۔ (روم ۲۔۶)

رومی قریب کی زمین میں مغلوب ہو گئے ہیں مگر مغلوب ہونے کے بعد چند سال میں پھر وہ غالب آ جائیں گے، پہلے اور پیچھے سب اختیار خدا کے ہاتھ میں ہے اور اس دن مسلمان خدا کی مدد سے خوش ہوں گے وہ جس کی چاہتا ہے مدد کرتا ہے وہ غالب اور مہربان ہے خدا کا وعدہ ہے خدا اپنے وعدہ کے خلاف نہیں کرتا۔

''اس وقت جب کہ یہ پیشین گوئی کی گئی'' گبن لکھتا ہے'' کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی سلطنت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے''۔ (صفحہ ۷۴) مگر ظاہر ہے کہ یہ پیشین گوئی ایک ایسی ذات کی طرف سے کی گئی تھی، جو تمام ذرائع و وسائل پر تنہا قدرت رکھتا ہے اور انسانوں کے دل جس کی مٹھی میں ہیں، چنانچہ ادھر خدا کے فرشتے نے ایک امی کی زبان سے یہ خبر دی اور ادھر ہرقل قیصر روم میں ایک انقلاب آنا شروع ہو گیا، گبن لکھتا ہے۔

''تاریخ کے نمایاں کرداروں میں سے ایک غیر معمولی کردار وہ ہے، جو ہرقل کے اندر ہم دیکھتے ہیں، اپنے لمبے دور حکومت کے ابتدائی اور آخری سالوں میں یہ شہنشاہ سستی، عیاشی اور اوہام کا بندہ دکھائی دیتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی مصیبتوں کا ایک بیحس اور نامرد تماشائی ہے، مگر صبح و شام کا بے رونق کہر، دوپہر کے سورج سے کچھ دیر کیلئے چھٹ جاتا ہے، یہی حال ہرقل کا ہوا، محل کا آرکے ڈیس (ARCADIUS) یکا یک میدان جنگ کا سیزر (CAESAR) بن گیا۔ اور روم کی عزت چھ جرات مندانہ مہموں کے ذریعہ دوبارہ حاصل کر لی گئی، یہ رومی مورخین کا فرض تھا کہ وہ حقیقت سے پردہ اُٹھاتے اور اس کی اس خواب اور بیداری کے وجوہ بیان کرتے، اتنے دنوں بعد اب ہم یہی قیاس کر سکتے ہیں کہ اس کے پیچھے کوئی سیاسی

اسباب نہیں تھے، بلکہ یہ زیادہ تر اس کے شخصی جذبے کا نتیجہ تھا، اسی کے تحت اس نے اپنی تمام دلچسپیاں ختم کر دیں، حتیٰ کہ اپنی بھانجی (MARTINA) کو بھی چھوڑ دیا جس سے اس کو اس قدر تعلق تھا کہ محرم ہونے کے باوجود اس کے ساتھ اس نے شادی کر لی تھی"۔

(GIBBON, VOL V.PP 76-77)

وہی ہرقل جس کی ہمت پست ہو چکی تھی اور جس کا دماغ اس سے پہلے کچھ کام نہیں کرتا تھا، اب اس نے ایک نہایت کامیاب منصوبہ بنایا، قسطنطنیہ میں بڑے عزم و انہماک کے ساتھ جنگی تیاریاں شروع ہو گئیں، تاہم اس وقت صورت حال ایسی تھی کہ ۶۲۲ء میں جب ہرقل اپنی فوجیں لے کر قسطنطنیہ سے روانہ ہوا تو لوگوں نے سمجھا کہ دنیا رومن امپائر کا آخری لشکر دیکھ رہی ہے۔

ہرقل جانتا تھا کہ ایرانی حکومت سمندری طاقت میں کمزور ہے، اس نے اپنے سمندری بیڑے کو پشت سے حملہ کیلئے استعمال کیا۔ اس نے اپنی فوجیں بحر اسود کے راستے سے گزار کر آرمینا میں اتار دیں اور وہاں عین اس مقام پر ایرانیوں کے اوپر ایک بھرپور حملہ کیا، جہاں سکندر اعظم نے اس وقت کی ایرانی سلطنت کو شکست دی تھی جب اس نے شام سے مصر تک اپنا مشہور مارچ کیا تھا، ایرانی اس غیر متوقع حملہ سے گھبرا گئے اور ان کے قدم اُکھڑ گئے، مگر ابھی وہ ایشیائے کوچک میں زبردست فوج رکھتے تھے، وہ دوبارہ اس فوج سے حملہ کرتے اگر ہرقل نے اس کے بعد شمال کی جانب سمندر سے اسی قسم کی دوسری غیر متوقع چڑھائی نہ کی ہوتی، پھر وہ سمندر کے راستہ سے قسطنطنیہ واپس آیا، آواریوں (AVARS) سے ایک معاہدہ کیا اور ان کی مدد سے ایرانیوں کو ان کے دارالسلطنت کے گرد روک دیا، ان دو حملوں کے بعد اس نے مزید تین مہمیں جاری کیں۔۔

۶۲۳ء میں، ۶۲۴ء میں یہ مہمیں بحر اسود کے جنوبی ساحل سے حملہ آور ہو کر ایرانی قلمرو میں گھسیں اور میسوپوٹامیا تک پہنچ گئیں، اس کے بعد ایرانی جارحیت کا زور ٹوٹ گیا اور تمام رومی علاقے ایرانی فوجوں سے خالی ہو گئے، اب ہرقل خود ایرانی شہنشاہیت کے قبلہ پر حملہ کرنے کی پوزیشن میں تھا، تاہم آخری فیصلہ کن جنگ دجلہ کے کنارے نینوا کے مقام پر دسمبر ۶۲۷ء میں ہوئی۔

اب خسرو کی ہمت چھوٹ گئی تھی، وہ اپنے محبوب محل "دستگرد" سے بھاگنے کی تیاری کرنے لگا مگر اسی دوران خود اس کے محل کے اندر اس کے خلاف بغاوت ہو گئی، اس کے لڑکے شیرویہ نے اس کو گرفتار کر کے ایک تہہ خانے میں بند کر دیا جہاں وہ پانچویں دن بیکسی کی حالت میں مر گیا، اس کے اٹھارہ لڑکوں کو اس کی آنکھ کے سامنے قتل کر دیا گیا، مگر اس کا یہ لڑکا بھی آٹھ مہینے تخت پر رہ سکا، اس کے بعد دوسرے شہزادے نے اس کو قتل کر کے تاج پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح شاہی خاندان کے

اندر آپس میں تلواریں چلنا شروع ہوگئیں، یہاں تک کہ چار سال میں نو بادشاہ بدلے گئے، ان حالات میں ظاہر ہے کہ از سر نو رومیوں کا مقابلہ کرنے کا کوئی سوال نہیں تھا، خسرو پرویز کے بیٹے قباد ثانی نے رومی مقبوضات سے دست بردار ہو کر صلح کر لی، مقدس صلیب کی اصل لکڑی واپس کر دی گئی اور مارچ ۶۲۸ء میں فاتح ہرقل اس شان سے قسطنطنیہ واپس آیا کہ اس کے رتھ کو چار ہاتھی کھینچ رہے تھے اور بے شمار لوگ دار السلطنت کے باہر لیمپوں اور زیتون کی شاخوں کو لئے ہوئے اپنے ہیرو کے استقبال کیلئے موجود تھے۔ (صفحہ ۹۴)

اس طرح قرآن نے رومیوں کے دوبارہ غلبہ کے متعلق جو پیشین گوئی کی تھی وہ ٹھیک اپنے وقت پر (دس سال کے اندر) مکمل طور پر پوری ہوگئی۔

گبن نے اس پیشین گوئی پر حیرت کا اظہار کیا ہے، مگر اسی کے ساتھ اس کی اہمیت گھٹانے کیلئے اس نے بالکل غلط طور پر اس کو خسرو کے نام آپ کے دعوت نامے کے ساتھ جوڑ دیا ہے، وہ لکھتا ہے۔

''ایرانی شہنشاہ نے جب اپنی فتح مکمل کر لی تو اس کو مکہ کے ایک گمنام شہری کا خط ملا جس میں اس کو دعوت دی گئی تھی کہ وہ محمد ﷺ کو خدا کے پیغمبر کی حیثیت سے تسلیم کرے، اس نے دعوت کو نامنظور کر دیا اور خط کو چاک کر دیا، رسول عربی کو جب خبر ملی تو انہوں نے کہا'' خدا اسی طرح خسرو کی سلطنت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا اور اس کی طاقت کو برباد کر دے گا''۔ مشرق کی دو عظیم سلطنتوں کے عین کنارے بیٹھے ہوئے محمد ﷺ ان دونوں حکومتوں کی باہمی تباہی سے اندر ہی اندر خوش ہوتے رہے اور ایرانی فتوحات کے عین وسط میں انہوں نے یہ پیشین گوئی کرنے کی جرات کی کہ چند سال کے بعد فتح دوبارہ رومیوں کے جھنڈے کی طرف لوٹ آئے گی، اس وقت جبکہ یہ پیشین گوئی کی گئی، کوئی بھی پیشگی خبر اتنی بعید از وقوع نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ ہرقل کے ابتدائی بارہ سال رومی شہنشاہیت کے خاتمہ کا اعلان کر رہے تھے''۔

(GIBBON, VOL.V.PP. 73-74)

مگر اسلامی تاریخ کا ہر مورخ جانتا ہے کہ اس پیشین گوئی کا خسرو کے نام دعوت نامے سے کوئی تعلق نہیں، کیونکہ شہنشاہ ایران کے نام اسلام کا دعوت نامہ ہجرت کے ساتویں سال صلح حدیبیہ کے بعد بھیجا گیا ہے، جو سن عیسوی کے لحاظ سے ۶۲۸ء ہوتا ہے، جبکہ پیشین گوئی ہجرت سے پہلے مکہ میں ۶۱۲ء میں نازل ہوئی تھی۔ (جاری ہے)

سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی انفرادیت

1۔ دوسرے سلسلوں کی روحانی معراج اور آخری منزل کشف وکرامات کا حصول ہے لیکن ہمارے سلسلہ میں اُنکی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ ہمارے سلسلہ کا آخری مقصد اللہ کا قرب، عرفان اور لقاء کا حصول ہے۔

2۔ بزرگان عظام اور اولیائے کرام کی کرامات برحق اور انکی دعاؤں کی مقبولیت مسلم لیکن ہم مشکل کشاء اور حاجت رواصرف اللہ تعالیٰ کی ذات کو مانتے ہیں۔

3۔ موجودہ دور کی مصروف زندگی کو مدنظر رکھتے ہوئے مختصر اور سہل اوراد واذکار تلقین کیئے جاتے ہیں۔

4۔ ہمارے سلسلہ میں مجاہدہ کیلئے غصہ اور نفرت کو مکمل طور پر نفی کرنے اور عالمگیر محبت اور صداقت کو اختیار کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ یہ تربیت گھر کی چاردیواری کے اندر احسن طریقے سے ہوسکتی ہے۔

5۔ بانی سلسلہ توحیدیہ کے وصیت نامہ کے مطابق سلسلہ توحیدیہ کے روحانی پیشوا کا منصب ہمیشہ ہمیشہ کیلئے غیر وارثتی ہوگا۔

6۔ سلسلہ عالیہ توحیدیہ کی تعلیم مذہبی گروہ بندیوں اور فرقہ واریت سے بالاتر اور وسعت قلب ونظر کی مظہر ہے۔

7۔ ہمارے سلسلہ میں مریدوں کی تعداد بڑھانے کیلئے اندھا دھند بیعت نہیں کیا جاتا ہر شخص کو بیعت کرنے سے پہلے کم از کم چھ ماہ طالب رکھا جاتا ہے تاکہ وہ جماعت کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ ہوکر داخل سلسلہ ہو۔

8۔ سلسلہ توحیدیہ میں متوازی زندگی بسر کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ جس میں نہ تو دنیا کو ترک کرنے کی اجازت ہے اور نہ ہی اِس میں غرق ہوجانے کی۔

بانی سلسلہ عالیہ توحیدیہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کی شہرہ آفاق تصانیف

تعمیر ملت

قرون اولیٰ میں مسلمانوں کی بے مثال ترقی اور موجودہ دور میں زوال وانحطاط کی وجوہات
اسلامی تصوف کیا ہے؟ سلوک طے کرنے کا عملی طریقہ، سلوک کا ماحصل اور سلوک کے ادوار
ایمان محکم کس طرح پیدا ہوتا ہے؟ عالم روحانی کی تشریح، جنت، دوزخ کا محل وقوع
اور ان کے طبقات کی تعداد، انسانی روح کی حقیقت کیا ہے؟ روح کا دنیا میں آنا اور
واپسی کا سفر، اسلامی عبادات، معاملات، اور اخلاق و آداب کے اسرار و رموز اور نفسیاتی
اثرات، امت مسلمہ کے لئے اپنے کھوئے ہوئے مقام کے حصول کیلئے واضح لائحہ عمل۔

چراغ راہ
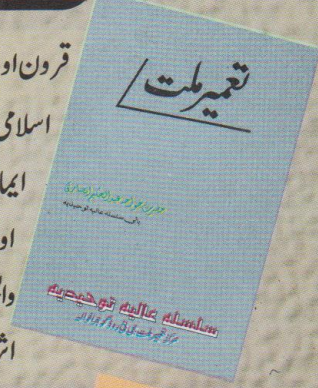
کتاب ہذا بانی سلسلہ خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ کے خطبات پر مشتمل ہے۔ جو آپ نے سالانہ
اجتماعات پر ارشاد فرمائے اسمیں درج ذیل خصوصی مسائل پر روشنی ڈالی گئی۔
سلوک و تصوف میں ذاتی تجربات، مرشد کی تلاش کے دس سالہ دور کا حال۔
زوال امت میں امراء، علماء، صوفیا کا کردار۔ علماء اور صوفیاء کے طریق اصلاح کا فرق۔
تصوف خفتہ اور بیدار کے اثرات اور تصوف کے انسانی زندگی پر اثرات۔
سلسلہ عالیہ توحیدیہ کے قیام سے فقیری کی راہ کیونکر آسان ہوئی۔

طریقت توحیدیہ
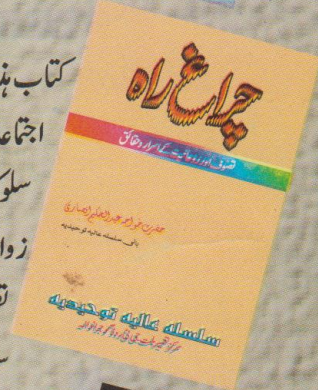
یہ کتاب سلسلہ عالیہ توحیدیہ کا آئین ہے۔ اس میں سلسلے کی تنظیم اور عملی سلوک کے طریقے
تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔ جو لوگ سلسلہ میں شامل ہونا چاہتے ہیں انہیں یہ
کتاب ضرور پڑھنی چاہئے۔ حضرت خواجہ عبدالحکیم انصاریؒ نے تصوف کی تاریخ میں پہلی
مرتبہ فقیری کا مکمل نصاب اس چھوٹی سی کتاب میں قلم بند کر دیا ہے۔ اس میں وہ تمام
اوراد و اذکار اور اعمال و اشغال تفصیل کے ساتھ تحریر کر دیئے ہیں جس پر عمل کر کے
ایک سالک اللہ تعالیٰ کی محبت، حضوری، لقاء اور معرفت حاصل کر سکتا ہے۔

حقیقت وحدت الوجود

وحدت الوجود کے موضوع پر یہ مختصر سی کتاب نہایت ہی اہم دستاویز ہے۔
مصنفؒ نے وحدت الوجود کی کیفیت اور روحانی مشاہدہ کو عام فہم دلائل کی روشنی میں آسان
زبان میں بیان کر دیا ہے۔ آپ نے جن دیگر موضوعات پر روشنی ڈالی ہے وہ یہ ہیں:۔
حضرت مجدد الف ثانیؒ کا نظریہ وحدت الشہود، انسان کی بقا اور ترقی کیلئے دین
کی اہمیت اور ناگزیریت، بنیادی سوال جس نے نظریہ وحدت الوجود کو جنم دیا
اور روحانی سلوک کے دوران بزرگان عظام کو ہو جانے والی غلط فہمیاں۔